ثباتِ قصر و در و بام، خشت و گِل کتنا
عمارتِ دلِ درویش کی رکھو بنیاد

چندہ سالانہ پانچ روپے (صہ ر)

فی پرچہ آٹھ آنے (۸ر)

دار الاشاعت تعمیر ادب علوی برقی پریس بھوپال، سی، آئی

ماہنامہ **تعمیر** بھوپال

جنوری و فروری ۱۹۴۷ء

نگراں: علامہ محوی صدیقی لکھنوی، اُردو لکچرار، مدراس یونیورسٹی۔

مدیر: حامد صدیقی بی اے (جامعہ) قیمت سالانہ پانچ روپے

جلد نمبر ۱-۲ شمارہ نمبر ۱-۲ فی پرچہ آٹھ آنے

فہرست

(علوی برقی پریس بھوپال)

اب سے تقریباً چھ سال قبل کی بنیاد پر آج ہم از سرِ نو عمارت کی تکمیل کے لئے قدم اُٹھا رہے ہیں۔ ۷ ارجون سال ۱۹۴۱ء وہ مبارک تاریخ تھی جبکہ سہ روزہ اخبار تعمیر علامہ محوی صدیقی لکھنوی کی نگرانی میں جاری کیا گیا تھا لیکن جنگ کی آفات نے چند ماہ بعد ہی اُسے زندہ دفن کر دیا اور انتہائی کوششوں کے باوجود ہم اس کے لئے کاغذ فراہم نہ کر سکے۔ مجبور ہو کر صبر کیا اور چُپ ہو بیٹھے۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آج اُس نے ہمیں اس اقدام کی ہمت عطا فرمائی اور ہم "تعمیر" کو سہ روزہ کے بجائے ادبی ماہنامہ کی صورت میں پیش کرنے کی جرأت کر رہے ہیں۔

عام روش اور دیرینہ رسم رہی ہے کہ ہر نیا اخبار یا رسالہ اپنا تعارف کرائے اور اسی سلسلہ میں اجراء کے مقاصد واضح کرے۔ اغراض کو ناظرین کے سامنے گنائے اور اُن کی اتنی طویل فہرست پیش کرے کہ ادب نواز یا اہل زبان اس نئے صحیفہ کو ملک کا سب سے اعلیٰ و ارفع جان لیں۔ ہمارے خیال سے یہ بات غلط سی ہے کہ صحیفہ اپنی صفات، تحریکات اور لائحہ عمل تو ملک کے پڑھنے والوں کے روبرو رکھدے، اور اُن سے اپنی دانست میں خراج بھی حاصل کر لے، لیکن خود اُن صفتوں اور خوبیوں کا حامل نہ ہو اور چند ماہ بعد اپنی روش تبدیل کر ڈالے۔

ادبی ماہنامہ تیس ۳۰ اکتیس ۳۱ دن کے وقفے سے شائع ہوتا ہے، اور اپنے اندر کئی صفات اور کئی قابل توجہ محرکات رکھتا ہے۔ زبان کی خدمت اور وہ بھی اس لئے کہ زندگی کے ہر پہلو پر زبان کا نمایاں اثر پڑتا ہے، اہم ترین ہے، لیکن "تعمیرِ زبان" کے سلسلہ میں لائحہ عمل کی افراط و کثرت مقصد میں زیادہ بُعد و انتشار پیدا کر دیتی ہے، "صحافتی یا ادبی کارناموں" کے وعدے اپنی اہمیت اور اپنے اثر کو زائل کر دیتے ہیں۔ غور اس امر پر لازم ہے کہ آیا ہماری پوری قوم میں یہ کمزوری یا دباؤ اثر پذیر ہوا ہے یا صرف صحافتی طبقہ میں اس کے فاسد جراثیم نے جڑ پکڑ لی ہے۔ ہم اپنی کمزوریاں اور خرابیاں دوسروں پر منطبق کرتے اور ان پر الزام دھر کر خود الگ ہو جاتے ہیں۔ انصاف یہ کہتا ہے کہ قصور زیادہ اسی کا ہے جو غور و فکر تک کو زحمت تصور کرتا اور اسکی حدود سے

گریز پا ہے۔ صحافی کا کام راہ کی اونچ نیچ اور زمانے کے گرم و سرد کی پیش گوئی اور اُس سے بلا ڈگمگائے گزر جانے کی تدبیر الفاظ کی شکل و صورت میں اجاگر کر دینا ہے۔ رسائل صرف ایسے مضامین شائع کر سکتے ہیں جو ہر حال میں ملک کے لئے سود مند ہوں۔ ان سے نفع اندوزی اور فائدہ مندی ناظر کا کام ہے۔ رسائل آپ پر اخلاقی دباؤ ڈالتے ہیں، جن سے اثر پذیر ہونا بہبودی کا باعث اور نتیجہ کے لحاظ سے دین، معاشرت اور ملک کی ٹھوس خدمت ہے۔

حالات کا اقتضا اور ضروریات کا دباؤ رسائل و اخبارات جاری کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ تبلیغ زبانِ اردو اشاعت ادب کے ساتھ سیکڑوں مفید کام ہیں جو یہ رسائل انجام دیتے ہیں۔ ناظرین اپنی اپنی اہلیت و قوتِ عمل کے مطابق ان سے اصلاحی نکات اخذ کر سکتے اور اپنے تمام ماحول کو اُن میں رنگ سکتے ہیں۔ زبان کی ترویج کے سلسلہ کی پہلی کڑی اور پہلا قدم خود کی اصلاح ہے یعنی ہمیں جو مفید ادب مل سکے اُس کا مطالعہ کریں۔ مذہب، معاشرت اور سیاست میں اس کی پیروی کریں۔ اس کی بتائی اور سمجھائی ہوئی راہوں کو اپنائیں اور جب کسی قابل ہو جائیں تو اپنے گھر کی طرف متوجہ ہوں۔ خاندان کے اُن افراد کو اردو پڑھائیں جو اَن پڑھ ہیں اور بچیوں کو مستثنیٰ نہ گردانیں بلکہ اُن کی طرف زیادہ توجہ کریں۔ وقت کا وہ حصہ جو ہزار بہانوں سے ضائع کر دیتے ہیں گھر میں گزاریں اور کسی نہ کسی کو پڑھاتے رہیں۔ گھر کے بعد پڑوس کے غیر تعلیم یافتہ، اور پڑوس کے بعد وہ تمام افراد جو زبان سیکھنا تلی غرض سمجھتے ہیں زبان دانوں کے لئے جاذبِ توجہ ہونے چاہئیں ہم میں سے ہر اُردو داں یہ تو چلّاتا رہتا ہے کہ "اُردو بولو! اُردو پڑھو!! اُردو لکھو!!!" لیکن کسی نے یہ نہیں کیا کہ اپنے تفریحی وقت میں سے صرف دس پندرہ منٹ کی قربانی کر دیتا اور اُردو سے ہمدردی کا عملی ثبوت اس طرح پیش کرتا کہ اِن دس پندرہ دقیقوں میں چند الفاظ کسی کو ذہن نشین کرا دیا کرے۔ زبان کی تبلیغ و ترویج کا نہایت کم خرچ اور نہایت زود اثر طریقہ یہی ہے کہ کم از کم ایک سال میں ایک شخص کو ضرور پڑھا لکھا بنا دیا جائے۔ اس تحریک کا اثر آپ چند ماہ بعد ہی ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔

ملک میں رسائل کی کثرت ہمیں یہ جرات نہ دلاتی کہ "تعمیر" کو منظرِ عام پر لائیں لیکن دوسری زبانوں کی رفتارِ ترقی اور مسلمانوں میں اُردو سے دلچسپی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہم یہ اقدام کر رہے ہیں۔ ضرورت ہے کہ اُردو اخبارات و رسائل کی بھی وہی بہتات ہو جو غیر زبانوں کے جرائد کی ہے۔

ہر صوبہ اور ہر ریاست زبان کی خدمت میں ایک دوسرے سے بازی لیجانے کی جد وجہد کرے تاکہ مفید و کارگر ادب پیدا ہو اور متحدہ کوششوں سے بکثرت افراد مستفید ہو سکیں۔ رسائل کو کسی خاص جماعت کا ترجمان بنانا درست ہو سکتا ہے لیکن موجودہ ضروریات اور زبان اردو کی خدمت کے پیشِ نظر ایک ہی مطمعِ نظر ہو تو کام میں آسانی اور مقصد برآری میں مشکلات کی کمی ہوتی ہے۔ ہندوستان کے شمالی نصف حصہ میں صحافتی قحط نہیں، اس کے برعکس یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ وہاں کے رسائل، اخبارات وجرائد ملک کے بقیہ نصف حصہ کی خدمت بھی انجام دیتے اور مسلم عوام کی ضروریات کو پیش کرتے ہیں۔ اب یہ غور کرنا ہمارا فرض ہے کہ کیا صرف اتنی ہی خدمت کسی منظم جماعت کے مقابلہ میں ہم کو بقائے دوام حاصل کرا سکتی ہے؟ کیا دیگر زبانوں کا میدانِ عمل صرف نصف شمالی ہند ہے یا اُن کی کوششیں جنوب میں بڑھ اور پھیل کر اپنا قبضہ جما چکی ہیں؟ رنج و افسوس کے ساتھ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ دکن میں حیدرآباد کو مستثنیٰ کرنے کے بعد باقی تمام علاقہ اردو کے حق میں بنجر ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ زمین میں جان پڑ چکی ہے اور کہیں کہیں پودے بھی رونما ہو گئے ہیں لیکن ان کو تقویت پہنچانا اور نئے درختوں کو پروان چڑھانے کی فکر کرنا ملی بقا اور شمال سے جنوب کے مسلمانوں کو ملحق کرنے کے لئے از حد لازمی اور اشد ضروری ہے۔ شمالی ہند کے مقابلہ میں جنوب میں کام کرنے کی ضرورت اس لئے اور بھی ہے کہ صوبہ متوسط مالوہ، جنوب مغربی راجپوتانہ، مدراس، ملابار، غرضکہ نربدا سے جنوب کا پورا خطہ معاشرتی، معاشی، عمرانی، تمدنی، علمی، سیاسی، اور سب سے بڑھکر دینی نقطۂ نظر سے شمالی ہند کے دوسرے صوبوں کے مقابلہ میں پست ہے۔ یہ تمام کمزوریاں صرف زبان ہی کی ترویج سے دور کی جا سکتی ہیں مذہبی جوش اور مذہبی معلومات لوگوں میں موجود ہیں لیکن ایک دوسرے کی زبان سے واقفیت نہ ہونے کی بنا پر معاشرت میں رخنہ پڑ جاتا ہے۔ مثلاً ٹامل بولنے والے اُسی ماحول کو بہتر جانتے ہیں جس میں اُن کی بات سمجھی جائے، چاہے اُن کا مخاطب کوئی غیر مسلم گروہ یا جماعت اور معاشرہ ہی کیوں نہ ہو۔ یہی بات دیگر زبانیں بولنے والوں کے ہاں بھی نظر آتی ہے۔ یہ کھلا ثبوت اس بات کا ہے کہ زبان اتحادِ عمل کا بہترین محرک ہے۔ ہم کو سوچنا اور فکر کرنا چاہئے کہ اُردو کو اپنا کر ہم اپنی دنیا کس قدر وسیع کر سکتے ہیں۔

ہندوستان کے مسلمانوں کی بدحالی کا چرچا اس درجہ عام ہو گیا ہے کہ اب اُسی راگ کو الاپنا

بے موقعہ سی راگنی معلوم ہوتی ہے۔ خدا کے فضل سے موجودہ حالت وہ تو نہیں ہے جو آب سے تین چالیس سال قبل تھی، لیکن مرض کے جراثیم، خاص خاص افراد کو مستثنیٰ کرنے کے بعد، بکثرت موجود ہیں۔ عوام اس میں زیادہ گھرے ہوئے ہیں اور تعلیم و ترویجِ زبان ہی اُن کو مہلک مرض سے نجات دلانے کی بہتر ترکیب ہوسکتی ہے۔ ہمارے ہر کام میں بے ربطی اور بدنظمی موجود ہے، اس لئے کل ہند تحریکیں ہمیں کس نتیجہ پر پہنچا سکتی ہیں؟ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اپنے حلقہ کو محدود کریں اور اس کی اصلاح کے بعد قدم آگے بڑھائیں۔ حلقہ کی لامحدودیت ہر کارکن کا مطمحِ نظر ہونا چاہئے، لیکن عمل کے لئے ہر ابتدا کو اہم تصور کرنا اور اسی پر بڑے سے بڑے اور عالیشان سے عالیشان محل کی بنیاد رکھنی، ہم کو تکمیل کار و حصولِ مقصد کی طرف لے جائیگا۔

ہم موجودہ ضروریات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے آپ کے سامنے کوئی طویل لائحہ عمل پیش نہیں کر رہے ہیں۔ آپ میں سے ہزاروں شاعر، سیکڑوں مضمون نگار اور بیسیوں صاحبِ طرز ادیب ہیں۔ کئی حضرات قلتِ وقت کے شاکی ہیں اور وہ حق بجانب بھی ہیں، لیکن اکثریت ایسی ہے جو شعر و شاعری کی محفلوں کو گرم کرکے زبان کو ضرور تقویت پہنچاتے ہیں، مگر ٹھوس خدمت کیلئے وہ چند منٹ بھی نہیں دے سکتے۔ ہم ایسے بزرگوں اور دوستوں سے یہ استدعا کریں گے کہ وہ زبان کی خدمت کے لئے اپنی مصروفیات میں سے ہر روز چند منٹ مقرر کریں اور کسی اردو نہ جاننے والے تک اس زبان کو پہنچائیں تاکہ چند سال بعد ہی ہمارا ملک اردو کی دولت سے مالا مال ہو اور منتشر مسلمان ایک مرکز پر آکر اپنی تمام تحریکوں میں جان ڈال دیں۔

"تعمیر" اُسی وقت اپنے مقصد میں کامیاب ہوسکتا ہے جب کہ اس کے ناظرین اور اس کے کرم فرما اپنے حلقہ اثر کو اُردو داں بنادیں، جس کی خاص طور پر جنوبی ہند میں فی زمانہ ازحد ضرورت ہے۔

ہم ان تمام حضرات کے تہِ دل سے شکر گزار ہیں جو ہمارے کاموں کے لئے تقویت کا باعث بنے اور "تعمیر" کی "بہر نوع" خدمت کا وعدہ فرمایا۔

اس شمارہ میں جن شعرا کا کلام اور جن ادیبوں کے مضامین آپ آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمائینگے وہ ادبی دنیا میں ایک عرصے سے بلند درجہ کے مالک ہیں۔ میں اُن کی "تعمیر نوازی" کا شکریہ ادا کرتا اور "زورِ قلم" کے "زیادہ" ہونے کی دعا کرتا ہوں ✦

خطیب محمد اعظم مقبول

محمد مصطفیٰ وہ رتبۂ اعلیٰ تمہارا ہے

محمد مصطفیٰ ہم سے تمہارا وصف کیونکر ہو! — تمہارا مدح خواں جب عرش پر خلّاقِ اکبر ہو

نبیِ برگزیدہ ہو حبیبِ ربِّ داور ہو — تمہیں رہبر زمانے کے تمہیں نبیوں کے افسر ہو

شرفِ انساں کو اللہ نے مخلوق پر بخشا — تمہاری ہی بدولت بالیقیں تم وہ پیمبر ہو

تنِ اقدس سے سائے کو خدا نے دور ہی رکھا — کہ دنیا میں تمہارا کوئی ثانی ہو نہ ہمسر ہو

جہاں سے دور فرمایا غلامی کی مصیبت کو — کہ ہر انسان درجہ میں مساوی ہو برابر ہو

جہاں سے کشت و خونریزی کی بنیادیں ہلا ڈالیں — تم ایسے حامیِ امن و اماں ہمدردِ کشور ہو

محمد مصطفیٰ وہ رتبۂ اعلیٰ تمھارا ہے — قسیمِ آبِ کوثر ہو شفیعِ روزِ محشر ہو

خطاب بہ قوم

مسلمانو تمہیں دعویٰ ہے حضرت کی غلامی کا — مگر معلوم ہے کیسے عمل ہیں کس روش پر ہو

پڑی ہیں مسجدیں خالی ادھر تو تم نہیں آتے — ہزار افسوس لیکن رونقِ بازار و تھیٹر ہو

نہ ملک و قوم سے الفت نہ بھائی بھائی میں انسیت — نفاق و بغض میں تم مبتلا البتہ یکسر ہو

نقائص کتنے گنوائیں کلیجہ منہ کو آتا ہے — کرو کچھ فکر گر خوفِ خدا پاسِ پیمبر ہو

زمیں پر بھی ٹھکانہ پھر نہیں سن لو ذرا میرا — سنبھل جاؤ سنبھل جاؤ ابھی تو تم زمیں پر ہو

مسلمانوں کو رکھ قائم محمد کی شریعت پر
دعا مقبول کی مقبول اے خلاقِ داور ہو

حضرتِ فہمی ترمذی

(۱)

آج ہے سرکارِ حشر، برسرِ دربارِ حشر

عام ہے اَسرارِ حشر، گرم ہے بازارِ حشر

جمع ہے مخلوق سب

شاہِ فلک بارگاہ، خسروِ انجم سپاہ، مالکِ چتر و کلاہ، والیِ اورنگ و جاہ

اور کہیں تیغ زنِ، مردِ جری صف شکن، نیزہ و ناوک فگن، شیر تر بال پہ بلتین

عالمِ قدسی خیال، واعظِ شیریں مقال، پیکرِ حسن و جمال، عاشقِ آشفتہ حال

زاہدِ خلوت گزیں، عابدِ گوشہ نشیں، زار نحیف و حزیں، دین کے حبل المتیں

رندِ معاصی پرست، تارکِ بالا و پست، جام و صراحی بدست مست بہر حال مست

مضطرب و باادب، منتظرِ حکمِ رب

جمع ہے مخلوق سب

(۲)

آج جزا کا ہے دور، شاہ و گدا ایک طور
سب کے عمل زیرِ غور، تختِ عدالت ہے اور
داورِ یوم الحساب

شاعرِ رنگیں نوا، حاضرِ خدمت ہوا، سر بہ ادب خم کیا، پھر یہ ہوا نغمہ سرا
اے کہ جہاں آفریں، خالقِ روئے زمیں، صاحبِ عرشِ بریں، مالکِ دنیا و دیں
مظہرِ جاہ و جلال، مرکزِ حسن و جمال، مخزنِ فضل و کمال، پاک زِ شرک و زوال
سب سے ہے غنی، بے نیاز، سب کا مگر کارساز، منعم و بندہ نواز، واقف و دانائے راز
ذات جمیع الصفات، مصدرِ نورِ حیات، ناظمِ جہاں را ثبات، سجدہ گہہ کائنات
تیری مقدس جناب، مامنِ ہر شیخ و شاب
داورِ یوم الحساب

(۳)

دفعتاً اک بادشاہ، خوگرِ جرم و گناہ
فردِ عمل سب سیاہ، زار و بحالِ تباہ
آ کے ہوا داد خواہ

بولا کہ ربِّ جہاں، شاعرِ جادو بیاں، یوں تھا مدح خواں، آپ ہی نوشیرواں
مجھکو سلیماں کہا، حاتمِ ذی شاں کہا، رستمِ دوراں کہا، شیرِ نیستاں کہا
بخلِ سخاوت بنا، ظلم عدالت بنا، خوف شجاعت بنا، جھوٹ صداقت بنا
کر دیا بارِ الٰہ، مدح نے مجھ کو تباہ، سُن کے یہ تعریف آہ، ہو گیا گم کردہ راہ
حکمِ عدالت ہوا، شاعرِ آتش نوا، آئے یہاں تو ذرا، اور کہے ماجرا
یوں یہ کیا تھا گناہ، جس سے یہ گم کردہ راہ
آ کے ہوا داد خواہ

(۴)

سُن کے یہ شاعر بڑھا، اور یہ شہ سے کہا
قول تو ہے یہ بجا، میری مگر کیا خطا!
جرم سے میں ہوں بری

آپ نہ تھے ہوشمند، تھی نہ نصیحت پسند، ہر ہدایات و پند، کون اٹھا تا گزند
دیکھ کے یہ اشتعال، نخوت و قہر و جلال، میں نے کہا حسبِ حال، غلط بہ طرزِ مثال
آپ سلیماں نہ تھے، حاتم دوراں نہ تھے، شیر نیستاں نہ تھے، سیف کہ انساں نہ تھے
خود ہی تو ناداں بنے، کیوں وہ سلیماں بنے، حاتم دوراں بنے، شیر نیستاں بنے
عقل سے تھے آپ دور، بڑھ گیا کبر و غرور، ہو گئے غفلت میں چور، میرا ہے کیا قصور
تھی غلطی آپ کی، فہم کی تھی یا کمی
جُرم سے میں ہوں بری

(۵)

پیش ہوا پھر وہاں، ایک دلاور جواں
ایک قوی پہلواں، ہاتھ میں تیغ و سناں
جوش سے تیور پہ بل

غیظ و غضب کا شکار، دوش پہ ہو اپر سوار، بولا کہ پروردگار، شعر سے ہے آشکار
عیش کی پروانگی، رزم سے بیگانگی، اُٹھ گئی مردانگی، بڑھ گئی دیوانگی
شاعرِ زار و حزیں، کہنے لگا بالیقیں، آپ کو اے نکتہ چیں، یاد رجز بھی نہیں
شعر کا یہ تھا اثر، جنگ پہ باندھی کمر، ٹوٹ پڑے فوج پر، پا گئے فتح و ظفر
ہاں جو نہ ہو وقتِ رزم، گرم نہ پھر کیوں ہو بزم، رزم میں جرأت کا عزم، بزم میں عشرت کا نظم
دونوں کا ہے اک محل، آ گئے کیوں آج کل
آپ کے تیور پہ بل

(۶)

سُن کے یہ زاہد بڑھے، واعظ و عابد بڑھے
ناصح و ناقد بڑھے، بہرِ مفاسد بڑھے
اور ہوئے مدّعی

طعنے اشعار پر، ہجو کے طومار پر، بغض کے اظہار پر، لہجہ و گفتار پر
ہنس کے یہ اُس نے کہا، زہد ہو یا اتقا، کیا وہ تصنّع نہ تھا، تھی نہ عبادت ریا
حضرتِ واعظ ہے یاد، قول و عمل کا تضاد، جب ہو یہ وجہِ فساد، کیوں نہ ہو لازم جہاد
آپ کی یہ دار و گیر، سب کو سمجھنا حقیر، خود جو کہیں ناگزیر، وحیِ خدا اے فقیر
بت شکنی کا قصور، مجھ سے ہوا ہے ضرور، آپ کا بت اے حضور، میں نے کیا چور چور
میں نے اڑائی ہنسی، نخوت و پندار کی
آپ ہوئے مدّعی

(۷)

یہ جو سُنی گفتگو، حُسن ہوا کینہ جو
اور کہا یہ کہ تو، مجھ سے رہا دوبدو
اور جو چاہا کہا

تو مجھے قاتل کہے، جور پہ مائل کہے، ظلم میں کامل کہے، فتنۂ محفل کہے
میں ستم ایجاد ہوں، بانیِ بیداد ہوں، ظلم میں استاد ہوں، سنگ ہوں؟ فولاد ہوں؟
تیر ہے میری نظر؟ چھد گیا تیرا جگر؟ جھوٹ بھی اور اس قدر؟ کچھ تو خدا سے بھی ڈر؟
یہ تو بتا بدنصیب! کون تھا تیرا رقیب؟ جس کا بنا میں حبیب، مجھ پہ یہ تہمت عجیب
شکوۂ دلدار بھی، حسرتِ دیدار بھی، ہجر کا طومار بھی، وصل کا اقرار بھی
کیا کہوں کیا کیا کہا، جی میں جو آیا کہا
اور جو چاہا کہا

(۸)

بولا یہ شاعر کہ واہ، آپ بھی ہیں دادخواہ
کیوں نہ ہو دنیا تباہ، ہو گئے احساں گناہ
اور یہ الزام آئے
مجھ سے ہوئے آشکار، حسن کے نقش و نگار، بن گیا انجام کار، آپ کا میں اشتہار
ذوق خود آرائی تھا، زہد شکن فتنہ زا، یہ خم زلف دوتا، غازۂ رنگ حنا
غمزہ، نازو ادا، شوخی بے شرم و حیا، عشوۂ جور و جفا، شیوۂ مہر و وفا
آپ کو آتے تھے کب، میں نے سکھائے یہ سب، آپ ہوئے بے سبب، در خور قہر و غضب
اب نہ اٹھے یہ سوال، سن کے رقابت کا حال، آپکو ہو گا ملال، اور مجھے انفعال
میری زباں کھل نہ جائے، جو مجھے مجرم بنائے
مجھ پہ یہ الزام آئے

(۹)

عشق بھی تھا باریاب، بڑھ کے کیا یوں خطاب
شاعرِ والاجناب، دیجئے مجھ کو جواب
عشق و محبت ہوں میں
کھولئے بندہ نواز، عشق حقیقی کا راز، کیجئے ترجیح یار، ہیئے کہ دکھایا مجاز
دیجئے یہ بھی بتا، صادق و کاذب ہے کیا، آپ کو کیونکر ہوا، مجھ پہ گماں کذب کا
اس نے کہا یہ کہ بس، آپ کو اے ہم نفس، اس میں ہے کیا پیش و پس، جب کریں اہلِ ہوس
حسن پرستی شعار، بوالہوسی اختیار، جب ہو غرض پر مدار، عشق ہے سب خام کار
درد کی لذت نہ پوچھ، کرب کی راحت نہ پوچھ، غم کی مسرت نہ پوچھ، سوز کی عشرت نہ پوچھ
رازِ حقیقت ہوں میں، سازِ محبت ہوں میں
عشق کی دولت ہوں میں

(۱۰)

سُن کے یہ ربّ العُلا، خود متوجّہ ہوا
اور یہ ہنس کر کہا، اہل نہ تھا تو ذرا
کشمکشِ دہر کا
ہمتِ عالی تری، کچھی ہے رفعت وہی، اوڑھنی مقتضی گلشنِ فردوس کی
خاطرِ ایذا پسند، سوزِ دلِ دردمند، ان کو نہیں کچھ گزند، آگ سے یہ ہیں بلند
تجھ سے یہ دونوں ہیں پست، تو تو ازل سے ہے مست، دیکھ حقیقت پرست، جلوۂ روزِ اَلَست
کہہ کے یہ اُلٹی نقاب، ہوگیا ہا آب و تاب احسنِ ازل بے حجاب، شاعرِ خانہ خراب
کرنے لگا بار بار، نعرۂ مستانہ وار، اور گرا بے قرار، خاک پہ ہو کر نثار
پھر نہ ملا کچھ پتا، اور یہی تھا صلا
کشمکشِ دہر کا

(۱۱)

شوق بنا مدعا، جوش ہوا رہنما
شاعرِ رنگیں نوا، اصل میں گم ہوگیا
جذب ہوا کھو گیا
آگئی بے انتہا، خلدِ بریں میں بہا، ہونے لگا بار با، شعر کا حسن آشکا
ہر در و دیوار سے، بارشِ انوار سے، سبزہ گلزار سے، شاخ و گل و خار سے
غنچہ و گل کی مہک، اور کلی کی چٹک، نورِ اُفق کی چمک، رنگِ شفق کی جھلک
جلوۂ حق کا ظہور، نغمۂ حمدِ طیور، کیفِ شرابِ طہور، غازۂ رخسارِ حور
نکہتِ بادِ صبا، مستیٔ موجِ ہوا، وجد میں ساری فضا، دیتے ہیں کچھ کچھ پتا
شاعرِ گم نام کا، وہ انھیں چیزوں میں تھا
جذب ہوا کھو گیا

غزل

مولانا عزیز مالیگانوی

نہ پوچھو کیا ہے ہماری ہستی، کہ راز فطرت کا راز میں ہے
تجلیِ شاہدِ حقیقت نہاں لباسِ مجاز میں ہے

کسی کے نقشِ قدم کا پر تو جبینِ سجدہ طراز میں ہے
یہ بندگی وہ ہے قدر جس کی نگاہِ بندہ نواز میں ہے

دلِ شکستہ کے تار کو تم نگہ کی مضراب سے نہ چھیڑو
تڑپ کے نکلے نہ وہ نوائے الم جو اس ٹوٹے ساز میں ہے

بنے تو اُن کے ہر ایک نقشِ قدم کو جزوِ جبیں بنا لوں
مٹے تو اس دہر سے مٹا دوں جو فرق ناز و نیاز میں ہے

وہ رات پچھلی وہ ہو کا عالم جبیں کسی کی کسی کی چوکھٹ
اِدھر کوئی سر پٹک رہا ہے اُدھر کوئی خوابِ ناز میں ہے

بجا ہے ارشاد تیرا واعظ، شراب پینا حرام لیکن
پلا دے ساقی جو آنکھوں آنکھوں میں، مے جو حدِ جواز میں ہے

شراب کے کیف کو بڑھا دے مزہ تو ہے مے کو مے بنا دے
ملا دے ساقی وہ مے کا قطرہ جو دیدۂ نیم باز میں ہے

عزیزؔ ہر نقش کو مٹا کے جہاں سے چھوڑے گا یہ زمانہ
مگر وہ نقشِ وفا جو میری جبینِ سجدہ طراز میں ہے

ادیب سہارنپوری

آئینہ

طائرِ ادراک کی پرواز آفاقی نہیں — روح میں پاکیزگی کا نام تک باقی نہیں

عقل کی ضو پاشیوں نے روح کو دھندلا دیا — ہائے خود بادِ صبا نے باغ کو کملا دیا!

دور بینی کی ہوس، اہلِ نظر کو کھا گئی — ہائے ہائے شاخ خود برگ و ثمر کو کھا گئی

نعمتِ صدق و صفا سے گھر کے گھر محروم ہیں — عجز، اخلاص و وفا، الفاظ بے مفہوم ہیں

آپ ہی اپنا نمونہ ہے یہ دورِ روزگار — بھوک ہے علم و ادب کی کاوشوں کا شاہکار

جلوۂ ہر رنگ، معیارِ نظر بننے لگا — جا بجا ذوقِ سیہ کاری "ہنر" بننے لگا

خیر سے وہ لوگ کہلانے لگے ہیں خضرِ راہ — جن کا ظاہر تو درخشاں ہے مگر باطن سیاہ

جن کی دنیا میں خدا او ناخدا کچھ بھی نہیں — مستقل بد اعتمادی کے سوا کچھ بھی نہیں

پاسبانِ حق، فریبِ ناروا دینے لگے — "جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے"

دوستوں نے دوستوں کو بزم سے اٹھوا دیا — کارواں سالار نے خود کارواں لٹوا دیا

عشق کی دنیا سے رسمِ تازہ ایجادی گئی — خسروی ہی خسروی باقی ہے فرہادی گئی

تک رہی ہے تیرگی آسودہ ایوانوں کو شمع
خود ہی گھر گھر ڈھونڈتی پھرتی ہے پروانوں کو شمع

حضرتِ سہیل مالیگانوی

مقاماتِ سہیل

اے دیدہ ورو تم کو سہیلِ جگر افگار
اس حال میں اب محفلِ امکاں میں ملے گا

بتخانۂ پندار سے آزردہ و رنجور
سرگرمِ سخن شکوۂ یزداں میں ملے گا

ٹھکرائے ہوئے بارگہِ اہلِ حَشَم کو
آزاد کسی کُلبۂ احزاں میں ملے گا

پالانِ خری جان کے تشریفِ شہی کو
سرمستِ غنا خرقۂ سلماںؓ میں ملے گا

تسنیم سے منہ موڑ کے وہ تشنۂ شمشیر
مصروفِ رجز گنجِ شہیداں میں ملے گا

سر بر درِ تسلیم و نظر بر سرِ خنجر
تاراجگہِ دشمنِ ایماں میں ملے گا

یوسف کی طرح دولت و اقبال سے ہٹ کر
پامالِ ستم حلقۂ اخواں میں ملے گا

فرعون کو پکار کا اعلان سنا کر
حیرانِ طلبِ موسیٰ عمراں میں ملے گا

ابلیس سے سن کر سخنِ ذلتِ آدم
مغمومِ عزاداریِ انساں میں ملے گا

گنجینۂ گوہر میں اُسے دیکھتے کیا ہو
وہ اشک صفت دیدۂ گریاں میں ملے گا

ڈھونڈو نہ اُسے باغ و گلستاں کی فضا میں
افسردگیِ روئے غریباں میں ملے گا

ڈھونڈو نہ اُسے انجمنِ لالہ و گل میں
خونیں جگروں کے دلِ سوزاں میں ملے گا

ڈھونڈو نہ اُسے قہقہۂ بزمِ طرب میں
وہ نالہ و فریاد کے طوفاں میں ملے گا

ڈھونڈو نہ اُسے جامِ خوش رنگ کے اندر
آزردگیِ چاکِ گریباں میں ملے گا

وحشت کدۂ حسرت و ارماں سے نکل کر
خاموش کہیں کوچۂ حرماں میں ملے گا

آبادیِ کونین کے اَسرار بتا کر
برباد کسی گوشۂ ویراں میں ملے گا

جس حال میں ملتا نہیں انسان سے انساں
تم سے وہ اُسی حالِ پریشاں میں ملے گا

جس درد میں ہوتے نہیں احباب کے احباب
تم سے وہ اُسی درد کے درماں میں ملے گا

القصہ جہاں کھوج لگاؤ گے تم اُس کا
مغمومِ عزاداریِ انساں میں ملے گا

آغا نوری درّانی

اعجازِ عشق

یہ بھی ہے کوئی زندگی، یہ کوئی زندگی نہیں
دل میں کبھی خوشی نہیں، لب پہ کبھی ہنسی نہیں

عشق میں چاشنی نہیں، حُسن میں دلکشی نہیں
رہ گیا نام عاشقی، حاجتِ زندگی نہیں

آ کہ ترے بغیر کچھ، جینے میں دلکشی نہیں
پھول نہ ہوں جو باغ میں، باغ میں تازگی نہیں

درد وہی، تڑپ وہی، ٹیس ہوئی کسک وہی
دل کی وہی ہیں کلفتیں، اُن میں کوئی کمی نہیں

گھر کو لُٹا چکا ہوں میں، داغ بھی کھا چکا ہوں میں
پھر بھی تری نگاہ میں، عزتِ بے کسی نہیں

عشق کا ہے یہ معجزہ، حُسن کا یا کوئی فسوں
اُن کی خوشی سے خوش ہوں میں، میری کوئی خوشی نہیں

کہہ کے یہ ایک غم نصیب چل دیا اس جہان سے
ختم ہو جس سے زندگی، وہ کوئی زندگی نہیں

تیرے تصورات میں صبر و قرار کھو دیا!
پھر بھی تو قابل قبول میری یہ بندگی نہیں

صبر و رضا میں آسکا کوئی نہ میرے سامنے
شیوۂ جور میں اگر تیری برابری نہیں

مجھ کو فروغِ زندگی حاصل اگر نہیں تو کیا
تیرے کرم پہ ناز ہے درد کی تو کمی نہیں

نبض جواب دے چکی اور طبیب تھک گئے
آ کہ امیدِ زندگی خاک بھی اب رہی نہیں

نوریؔ مبتلائے غم جی کے کرے تو کیا کرے
نام کی زندگی ہے اب، کام کی زندگی نہیں

عمران انصاری

زندگی کے چشمے

اساتذہ کی اہم خدمتیں مسلّم ہیں!
مگر ستم ہے کہ وہ آج وقفِ ماتم ہیں

وہ دار و گیر ہے جاری کہ جس کی حد ہی نہیں
جہاں پناہ ملے ایسی کوئی مدہی نہیں

مفکّرین کو عافیتِ خیال نہیں
مگر جو کسب کریں ہاں! انھیں زوال نہیں

یہ ٹیوشنوں کے سہارے پہ جی رہے ہیں اب
کہ جیسے بھیک ملے کچھ بقیدِ نام و نسب

جوان ہونے سے پہلے جوانیاں رخصت
دلوں میں گھٹ کے جوانی کی رہ گئی حسرت

خود اُن کے بچّے جہالت سے واغدار ہیں آج
رہا ہی فرق پہ جن کے کہ علم و فضل کا تاج

یہی ہیں وہ کہ جو تخلیق قوم کرتے تھے!
دل و دماغ میں دنیا کے علم بھرتے تھے

وزیر و میر ہزاروں یہ ڈھال دیتے تھے!
یہ آدمی کو فلک پر اُچھال دیتے تھے

مگر زمانے کے یہ بھی عجب کرشمے ہیں
وہی ہیں خشک کہ جو زندگی کے چشمے ہیں

سرشار کسمنڈوی

غزلِ سرشار

محبت کا عنصر اگر ہو زیادہ
وہ جلوے بھی دل سے کریں استفادہ

ہمیں نے اُنھیں دل دیا بے ارادہ
ہمیں پر تباہی بھی آئی زیادہ

جنونِ محبت جسے ہو زیادہ
مری زندگی سے کرے استفادہ

ہمیں کو نہیں جرأتِ استفادہ
ہماری ہی منزل ہماری ہی جادہ

فروغِ نظر کا وہ رنگیں ارادہ
کہیں موجِ ایمن کہیں موجِ بادہ

زمانے کی رفتار کی روشنی میں
بدلنا پڑا ہر قدم پر ارادہ

کبھی زندگانی، کبھی موت پیاری
نہ ملتی ہے منزل نہ چھٹتا ہے جادہ

وسیع النظر کس قدر ہے محبت
نہ بے رنگ جلوہ نہ آنسو ہی سادہ

ترے عشق کی اس سیاست میں دل ہے
کبھی درد کم کم کبھی کچھ زیادہ

بلندوں کی یہ پستیاں اللہ اللہ
سواروں سے چلتا ہے آگے پیادہ

کہاں چوٹ پر چوٹ کھانے کی طاقت
نہ کر اپنی پہلی نظر کا اعادہ

یہ کن بے نشانوں کے نقشِ قدم ہیں
نہ عنوانِ منزل نہ تمہید جادہ

نہ کر اپنے عرفاں کی محدود راہیں
مرے دل پہ رہنے دے ان کو کشادہ

کرے کس توقع پہ اقدام کوئی
نہ پختہ عزائم، نہ محکم ارادہ

اب اتنا بھی سرشار حیراں نہیں ہو
نہ بڑھ اپنے جلووں کی حد سے زیادہ

درد کاکوروی

نویدِ انجام

کہتے ہیں جسکو زندگی ، درد وہ زندگی نہیں — جینے میں لطف کیا اگر ، درد کی چاشنی نہیں
کہتا ہے دل کہ بے سبب ، حسن کی بے رخی نہیں — دنیا پڑیگی جان بھی ، عشق ہے دل لگی نہیں
دل اُسے کیسے ہم کہیں ، جس میں شگفتگی نہیں — مرنے سے گر ہے احتراز ، کفر ہے عاشقی نہیں
دل میں شگفتگی کہاں ، وہ مرے ساتھ ہی نہیں — مستی و سرخوشی کہاں ، دولتِ زندگی نہیں
حسن کی شان عشق ہے ، عشق کی جان حسن ہے — جلوہ فگن ہے آفتاب ، ذرّوں میں روشنی نہیں
رقص میں آبشار ہے ، خلوتِ دل ہے اور چمن — ایسے میں تم چلے بھی آؤ ، غیر یہاں کوئی نہیں
خاک میں سب لطافتیں ، مہر بھی سربسر ہے قہر — آبِ حیات بھی ہے زہر ، تیری اگر خوشی نہیں
روح سی دوڑ جائے پھر ، ناز سے مسکرا دو پھر — گل میں شگفتگی نہیں ، پھولوں میں دلکشی نہیں
دل نہیں اختیار میں ، رنگ نہیں بہار میں! — گل ترے انتظار میں ، کوئی کلی کھلی نہیں
خاک ہوا ہے دل جگر ، آہ بنی ہے کیوں شرر — برقِ نظر تری اگر ، دل پہ مرے گری نہیں
تیری نگاہِ مست نے ، ساقی مجھے چھکا دیا! — ساغر و مے سے کام کیا ، فرصتِ میکشی نہیں!
ہستی کو اپنی بھول جا ، ہے یہ حریمِ کبریا! — جس میں ہو کبر اور ریا ، سجدۂ بندگی نہیں
دہر کی ہے ہر ایک شے ، درسِ عمل لئے ہوئے — جلوۂ باطنی بھی دیکھ ، صورتِ ظاہری نہیں
حسن کی رغبتیں ملول ، عشق کی دعوتیں فضول — حاصلِ بندگی اگر ، مقصدِ بندگی نہیں

اتنا مجھے بتا دے تو ، پائے گا کیا ستا کے تو
دردؔ کا توڑتا ہے دل ، حسن یہ دھاندلی نہیں؟

آدج مالیگانوی

میرا وطن

(تاریخ اسلام کا ایک دھندلا سا عکس)

جہاں سے نورِ حقیقت کی روشنی پھیلی
جہاں سے شمعِ ہدایت کی روشنی پھیلی
جہاں سے مذہب و ملت کی روشنی پھیلی
"قسم ہے ارض و سما کی وہ ہے وطن میرا"

وہ بزم بادۂ عرفاں، وہ اولیا کا مقام
وہ ذکر و فکر کی محفل، وہ اصفیا کا مقام
وہ ارض پاک جو ہے اکثر انبیا کا مقام
"قسم ہے ارض و سما کی وہ ہے وطن میرا"

جہاں تھی فقر کے ملبوس میں نہاں میری
جہاں دکھائی تھی مسلم نے شان شمشیری
جہاں ہم تھی جہانداری و جہانگیری
"قسم ہے ارض و سما کی وہ ہے وطن میرا"

وہ ملک انور و تیمور کا جو مدفن ہے
وہی زمین اتاترک کا جو مامن ہے
وہی زمین جو خاقان کا نشیمن ہے
"قسم ہے ارض و سما کی وہ ہے وطن میرا"

وہ خاکِ پاکِ فلسطیں، وہ کعبۂ اوّل
جہاں سے عظمتِ توحید کے اُٹھے بادل
جہاں سکوں کی فضاؤں میں آج ہے ہلچل
"قسم ہے ارض و سما کی وہ ہے وطن میرا"

تعمیر بھوپال

وہ روم و شام کی پُرکیف شام کیا کہئے
جہاں کہ نسبت ہے طارق کا نام کیا کہئے
جہاں ہے قبر امام الامام کیا کہئے

"قسم ہے ارض و سما کی وہ ہے وطن میرا"

وہ ہند خلجی و تغلق کے تھا جو زیر نگیں
وہ ہند جس پہ رہا حکمراں علاؤالدین
جہاں تھے اکبر و اورنگ زیب تخت نشین

"قسم ہے ارض و سما کی وہ ہے وطن میرا"

جہاں ہوں پھول سمجھ لو ہے گلستاں باقی
مکیں کی ذات سے ہے رونقِ مکاں باقی
جہاں جہاں کہ مسلماں کا ہے نشاں باقی

"قسم ہے ارض و سما کی وہ ہے وطن میرا"

غزل

وحشی اکبرآبادی

تری تلاش میں اس درجہ کھو گیا ہوں میں
کہ آج اپنا پتہ تجھ سے پوچھتا ہوں میں
کیا ہے سجدہ جسے خوب جانتا ہوں میں
نہ جانے کیا ہے جو مجبور ہو گیا ہوں میں
یہ کس کو آج تصور میں دیکھتا ہوں میں
فروغِ حسن سے عالم پہ چھا گیا ہوں میں
سمجھ رہی ہے مجھے بار زندگی میری
اور اس کو بار سمجھ کر اٹھا رہا ہوں میں
نگاہ جب طرفِ دل اٹھی تمہیں دیکھا
تلاش کس کی ہے اور کس کو دیکھتا ہوں میں
دوا کے نام سے تسکیں نہ دو دعا مانگو
تمہاری نظروں سے سب کچھ سمجھ گیا ہوں میں
تمہارا راز تو افسانہ ہو گیا ہوتا
جنوں کے پردے میں لیکن چھپا رہا ہوں میں
تمہیں بتاؤ یہ سامانِ دار کیسا ہے
جو تم سے میں نے سنا تھا وہ کہہ رہا ہوں میں
زمانہ کہتا ہے دیوانہ کیوں مجھے وحشی
مٹا کے ہستیِ دل، دل بنا رہا ہوں میں

غزل

حضرت قاضی سجاد محی الدین

ہے خبطِ عیش، عیش ارے بے خبر کہاں؟
دنیا ہی غمکدہ ہے تو غم سے مفر کہاں؟
جو التفات کی تھی نظر وہ نظر کہاں؟
پھر چشمِ تر میں، آہ میں اپنی اثر کہاں؟
گل کی بہار، شمع کا جلوہ ترے سبب
جب تو نہ ہو تو رونقِ شام و سحر کہاں؟
الفت سے پہلے بھی تھی تمنائے زندگی
ناصح خدا گواہ، مگر اس قدر کہاں؟
جس حسن پہ فدا ہوئے نکلا گریز پا
پہلو میں اپنے پہلے جو تھا وہ جگر کہاں؟
ٹھنڈی کرے جو آتشِ اندوہِ ہجر کو
ایسا اثر ہو جس میں وہ اب چشمِ تر کہاں؟
سجدے تمام ہو گئے جب صرفِ پاسباں
پھر اس کے آستاں پہ ہمارا گزر کہاں؟
انسان ہوں تو کچھ نہیں دشوار راہِ عشق
انساں برائے نام ہیں، انساں مگر کہاں؟
قاضیؔ تجلیات کے دریا میں بہہ نہ جا
ضبطِ عمل نہ ہو تو عمل میں اثر کہاں؟

رشید قمر آئی

بیتے ہوئے افسانے

یہ عہدِ رفتہ کے بیتے ہوئے فسانے ہیں

بس اپنی درد بھری یہ راگنی نہ چھیڑو تم
شکستہ دل ہوں مرا اور دل نہ توڑو تم
اُن اپنی مست نگاہوں کی ہے قسم تم کو
دلِ تباہ کی آہوں کی ہے قسم تم کو
قسم تمہاری محبت کی اور جوانی کی
قسم ہے میری غم آلود زندگانی کی

ہنوز یاد وہ گذرے ہوئے زمانے ہیں

نسیمِ صبح گجر دَم مجھے جگاتی ہے!
کسی حسین کا دلکش پیام لاتی ہے!
کہ تجھ پہ چھایا ہے یہ کس لئے سکوت وجمود؟
وہ برق ریز نگاہیں نہیں کہیں، محدود؟
ہنوز قدر ہے تیری جواں نگاہوں میں
ہنوز ہے، تری گرمی، حسین باہوں میں
تڑپ تڑپ کے محبت کی بھیک پا نہ سکے
جو میری راہ میں آنکھوں کو بھی بچھا نہ سکے
متاعِ صبر وسکوں کو لٹا چکا تو کیا؟
ہمارے واسطے آنسو بہا چکا تو کیا؟

بجا کہ یاد ہے پھولوں کی شانِ رعنائی
حسین کلیوں کی دوشیزگی و رعنائی
وہ برق پاشِ تبسم بھی یاد ہے اب تک
جنوں نواز تکلم بھی یاد ہے اب تک
وہ ایک سلسلۂ سوز و ساز در پردہ
کنارِ جو، وہ کسی کی نگاہِ شرمندہ
گداز جسم وہ گورا کہ پھول شرمائے
وہ کالے بال کہ جو چاندنی میں لہرائے

یہ عہدِ رفتہ کے بیتے ہوئے فسانے ہیں

اُنھیں مناظرِ دلکش کو پھر میں لاؤں گا
کہ اپنے سوئے ہوئے بخت کو جگاؤں گا
یہ کیا کہ عشق و محبت کی یادگار نہ ہو؟
غلط کہ دوست کا اپنے کچھ اعتبار نہ ہو

یہ عہدِ رفتہ کے بیتے ہوئے فسانے ہیں

سُرور و کیف سے پھر دل کو آشنا کر دے
وہ سوز و ساز طبیعت کو پھر عطا کر دے
کہ جس سے قلب و جگر کو قرار آجائے
اُسے بھی پیار تو، مجھکو پیار آجائے

یہ عہدِ رفتہ کے بیتے ہوئے فسانے ہیں

حضرت اخگر گلشن آبادی کا کلام دیر میں موصول ہوا۔ جس کا ہمیں افسوس ہے۔ آیندہ شمارہ میں انشاء اللہ پیش کیا جائے گا۔

عاشق قادری

شبابِ حسن

یہ مانا اُن کے اترانے کے دن ہیں
مگر میرے بگڑ جانے کے دن ہیں

شبابِ حسن کہتا ہے نکھر کر
یہی دن تو ستم ڈھانے کے دن ہیں

نہ چھیڑ اے آج ان رندوں کو زاہد
بہت کچھ اور سمجھانے کے دن ہیں

یہ شوقِ دید یہ عالم جنوں کا!
ترے کوچہ سے کیا جانے کے دن ہیں؟

پتا دیتی ہیں یہ اُن کی نگاہیں
شباب آیا حجاب آنے کے دن ہیں

مری میت پہ اُن کا ہنس کے کہنا
"نہ سمجھے تھے یہ مر جانے کے دن ہیں"

نہ جانے کیا گذر جائے گی ہم پر
نہ کہہ ساقی بہار آنے کے دن ہیں

یہ کالی راتیں یہ کالی گھٹائیں
سنبھل اے دل بگڑ جانے کے دن ہیں

ہے میٹھے سال کا عاشق ترانہ
نظر بازوں سے شرمانے کے دن ہیں

حاجی عزیز بنگلوری

اصنام کے ٹکڑے

نہ کر ظالم کسی کے بھی دلِ ناکام کے ٹکڑے
کہ ہو جائیں گے تیری تیغِ خون آشام کے ٹکڑے

کوئی کہہ دے یہ اُس سے دکھ نہ دے اتنے غریبوں کو
اُڑا دیں گے ابھی ہم چرخِ نیلی فام کے ٹکڑے

شعاعِ مہر، داغِ دل، شفق آہوں کا شعلہ ہے
اُڑائے ہیں فلک نے میری صبح و شام کے ٹکڑے

کبھی تڑپا کبھی رویا، کسی پہلو نہ چین آیا
شبِ ہجراں نے کر ڈالے مرے آرام کے ٹکڑے

کوئی مجنوں، کوئی وحشی، کوئی دیوانہ کہتا ہے
ہوئے ہیں یوں محبت میں ہمارے نام کے ٹکڑے

فلک پر چاند سورج ہیں، زمیں پر پھول اور غنچے
بنے ہیں مٹ کے کیا کیا میکشوں کے جام کے ٹکڑے

نہیں ہے طاقتِ پرواز تو کچھ غم نہ کر بلبل
اسی منقار سے کر دے قفس اور دام کے ٹکڑے

دوئی کا دیدۂ بینا سے جب اُٹھ جائے گا پردہ
تو ہو جائیں گے خود ہی واتق اوہام کے ٹکڑے

عزیز اُٹھ کر دو پھر سنّتِ محمود کو زندہ
اُڑا دو صفحۂ گیتی سے پھر اصنام کے ٹکڑے

اختر انصاری اکبر آبادی

"نینا" کے نام

اے حسیں طراز "نینا" اے سراپائے شباب! — اے کہ تیرا حسن ہے آئینۂ جامِ شراب
تیرے غمزے حشر ساماں، تیرے عشوے فتنہ ساز — تیری شوخی برق کی ہے اک حریفِ کامیاب
تیری زلفِ مشکبو لیلائے شب کی دوستدار — ضو فگن پیشانیٔ شفاف، رشکِ ماہتاب
تیری آنکھیں بادۂ انگور کے لبریز جام — تیری نظریں ہیں شعاعیں برق کی روحِ شباب
عارضِ تاباں، ضیا بارِ نگاہِ شوق ہیں — ہے بیک لمحہ طلوعِ آفتاب و ماہتاب
ہوش فرسا ہے ہر اک جلوہ تبسم کا ترے — جانفزا تیرا تکلم ہے، ترنم کامیاب
تیرا ہنسنا بے تکلف تیرا رونا برمحل — اے کہ ہے تیرے فریبِ ناز سے دنیا خراب
تیری محفل اک حریمِ عالمِ انوار ہے — تیری ہستی رقصِ پیہم، تیری مستی لاجواب
تیرا اندازِ خرام، اک فتنۂ محشر نما — موجۂ رفتار ہے، یا ہے کوئی جوئے شراب
تیری خاموشی کبھی سوہانِ جان و روح ہے — چھیڑتا ہے کیف زا نغمے کبھی تیرا رباب
اہلِ دل کی زندگانی ہے کبھی تیرا فریب — انجمن کی شادمانی ہے کبھی تیرا عتاب
اٹھ کے بنتی ہے قیامت بزم میں تیری نظر — گر کے بجلی سی گراتا ہے کبھی تیرا نقاب

تو حسیں بھی، شوخ بھی، فن کار بھی آفت بھی ہے
یوں تو سب کچھ ہے مگر یہ تو بتا عورت بھی ہے؟

تیرا عورت پن کہاں غارت ہوا اے فتنہ ساز — تیرے اندازِ حیا کیا ہو گئے اے جانِ ناز
کچھ سمجھتی ہے وفا نا آشنا اپنے طریق — بدنما تیری حقیقت خوشنما تیرا مجاز
خاندانی عظمتِ رفتہ کا ماتم کر چکی — فلم کی دنیا میں ہیں تیرے لئے راز و نیاز
ہوش میں آ ہوش میں، اے ناشناسِ عافیت — یہ تعیش کاریاں اچھی نہیں غمزہ طراز

جانتا ہوں میں تجھے فلمی اداکارہ ہے تو
جسم میں تہذیب کے اک عضوِ ناکارہ ہے تو

جوہر چاندوڑی

ایک ظالم حاکم سے

تو ہے کیا اور کیا تری ہستی
اس پہ اتنا غرور و بدمستی

انقلاب جہاں کو بھول نہ تو
سربلندی ہے آج، کل پستی

یہ حکومت ہے عارضی حاکم!
پاسِ انصاف رکھ ذرا ظالم!

تیغ ناحق چلا نہ حق پہ کبھی!!
منصفی کی مثال کر قائم

بے مروت، ستمگر و خودسر
ظلم بیجا نہ کر خدا سے ڈر

یاد رکھ عارضی ہے یہ ہستی
زندگی ہے مثالِ شمع سحر

عارضی شان پر یہ کرّ و فر
پڑ گئے تیری عقل پر پتھر

کہیں برقِ بلا نہ ٹوٹ پڑے
آہِ مظلوم سے ستمگر ڈر

گوشِ دل سے یہ سن ذرا خودسر
جور پر، ظلم پر، نہ باندھ کمر

جب اُتر جائے گا نشہ تیرا
روئے گا تو جہاں میں شام و سحر

ناخدا ترس، پُرجفا، ظالم
تو ہے رازِ جہاں کا گر عالم

حق ہی ناحق پہ غالب آتا ہے
یاد رکھ! یہ کلام اے حاکم

دودھ کا دودھ، پانی کا پانی
ہو ہی جاتا ہے، بات ہے مانی

حق کو ناحق نہ کر دکھا ظالم!
دیکھ ہوگا عتابِ ربانی

کچھ خبر بھی ہے، اُف رے بیدادی
اک زمانہ ہے تیرا فریادی

حق کی لاٹھی میں ہے کہاں آواز
حق پہ چل ورنہ ہوگی بربادی

کسی بیکس پہ کر نہ بیجا جبر
پڑ نہ جائے کہیں تجھی پر صبر

قولِ جوہرؔ کی قدر لازم ہے
ایک دن تُو ہے، اور گوشۂ قبر

حفیظ مالیگانوی

بے وفا وہ کس قدر ہیں اس جوانی کی قسم
اب بہاؤں گا نہ آنسو خوں فشانی کی قسم
ہو نہ رسوا اور دنیا میں جمالِ ہمنشیں
نوچ ڈالے پھول سارے باغبانی کی قسم
حسن ہے مجبورِ تمکیں، عشق سرشارِ جمال
مست ہیں دونوں شرابِ ارغوانی کی قسم
جس قدر چاہے ستم توڑے نگاہِ بے نیاز
غیر فانی ہے محبت عمرِ فانی کی قسم
ایسا نقشِ دلنشیں میں نے نہیں دیکھا کبھی
حسنِ صورت کی قسم، بہزاد و مانی کی قسم
لطف جینے میں نہیں ہے بلکہ مرجانے میں ہے
کس کو میں سمجھاؤں عمرِ جاودانی کی قسم
بجلیاں لہرا رہی ہیں سیکڑوں جذبات میں
حسنِ رنگیں کی قسم اپنی جوانی کی قسم
اک فریبِ آرزو کو آرزو سمجھا کیا!
بھول کی میں نے وفا کی زندگانی کی قسم
پھونک دو سارا گلستاں لوٹ لو ساری بہار
دوستو! اس بے حسی کی زندگانی کی قسم

عاقل رحمانی

پیغام

کمالِ زندگیِ مستعار پیدا کر
بقائے ہستیِ بے اعتبار پیدا کر
نگاہِ ناز کے پیہم یہی اشارے ہیں
نیازِ عشق میں اپنے وقار پیدا کر
اٹھا یہ پردۂ ہستی سنا وہی نغمہ
رگِ گلو کے لئے کوئی دار پیدا کر
نہ بھول جامہ دری اور نالۂ سحری
انھیں سے سوزشِ دل میں قرار پیدا کر
تلاشِ وادیِ ایمن کہاں تک اے ناکام
نگاہِ شوق [illegible] شکار پیدا کر
جنونِ عشق کو جھک جھک کے جو کرے سجدہ
فسونِ شوق سے وہ حسنِ یار پیدا کر
جہانِ بندگیِ جبر تا کجا آخر!
ادائے عشق میں کچھ اختیار پیدا کر
نشاطِ روح کی عاقل اگر تمنا ہے
تو پہلے خانۂ رنگیں نگار پیدا کر

کچھ خبر بھی ہے، اُف رے بیدادی | اک زمانہ ہے تیرا فریادی
حق کی لاٹھی میں ہے کہاں آواز | حق پہ چل، ورنہ ہوگی بربادی

کسی بیکس پہ کر نہ بیجا جبر | پڑ نہ جائے کہیں تجھی پر صبر
قولِ جوہرؔ کی قدر لازم ہے | ایک دن تو ہے، اور گوشۂ قبر

حفیظ مالیگانوی

بے وفا وہ کس قدر ہیں اس جوانی کی قسم
اب بہاؤ نگاہ نہ آنسو خونفشانی کی قسم

ہو نہ رسوا اور دنیا میں جمالِ ہمنشیں
نوچ ڈالے پھول سارے باغبانی کی قسم

حسن ہے مجبورِ تمکیں، عشق سرشارِ جمال
مست ہیں دونوں شرابِ ارغوانی کی قسم

جس قدر چاہے ستم توڑے نگاہِ بے نیاز
غیر فانی ہے محبت عمرِ فانی کی قسم

ایسا نقشِ دل نشیں میں نے نہیں دیکھا کبھی
حسنِ صورت کی قسم، بہزاد و مانی کی قسم

لطف جینے میں نہیں ہے بلکہ مرجانے میں ہے
کس کو میں سمجھاؤں عمرِ جاودانی کی قسم

بجلیاں لہرا رہی ہیں سیکڑوں جذبات میں
حسنِ رنگیں کی قسم اپنی جوانی کی قسم

اک فریبِ آرزو کو آرزو سمجھا کیا!
بھول کی میں نے وفا کی زندگانی کی قسم

پھونک دو سارا گلستاں لوٹ لو ساری بہار
دوستو! اس بے حسی کی زندگانی کی قسم

تعمیر بھوپال

عاقل رحمانی

کمال زندگیٔ مستعار پیدا کر
بہائے ہستیٔ بے اعتبار پیدا کر

نگاہِ ناز کے پیہم یہی اشارے ہیں
نیازِ عشق میں اپنے وقار پیدا کر

اٹھا یہ پردۂ ہستیٔ سنا وہی نغمہ
رگِ گلو کے لئے کوئی دار پیدا کر

نہ بھول جامہ دری اور نالہ و سحری
انھیں سے سوزشِ دل میں قرار پیدا کر

تلاشِ وادیٔ ایمن کہاں تک اے ناکام
نگاہِ شوق [illegible] ستیٔ تشنہ پیدا کر

جنونِ عشق کو جھک جھک کے جو کرے سجدہ
فسونِ شوق سے وہ حسنِ یار پیدا کر

جہانِ بندگیٔ جبر تا کجا آخر!
ادائے عشق میں کچھ اختیار پیدا کر

نشاطِ روح کی عاقلؔ اگر تمنا ہے
تو پہلے خانۂ رنگیں نگار پیدا کر

شریف وجدی بنگلوری

وہ دل کہ حسرتوں کا جنازہ کہیں جسے

اُن کا حجابِ نازِ تماشا کہیں جسے
میری نگاہِ شوق تقاضا کہیں جسے

ہر زخم وہ کہ دشت کا لالا کہیں جسے
ہر داغ وہ کہ عرش کا تارا کہیں جسے

میری ہر آہ حشر سرا پا کہیں جسے
ہر سانس وہ کہ شرحِ تمنا کہیں جسے

وہ میرا سر کہ جس میں ہے بے تابیٔ سجود
وہ پائے نازِ عشق کا کعبا کہیں جسے

اپنے ہی دوشِ غم پہ لئے پھر رہا ہوں میں
وہ دل کہ حسرتوں کا جنازا کہیں جسے

میرے جہانِ عشق کی بربادیاں نہ پوچھ
ہر ذرہ وہ کہ دل کا فسانا کہیں جسے

وہ گرمیٔ جمال کہ شعلہ ہے طور کا
دل کی تپش وہ آتشِ سینا کہیں جسے

سرشارِ کیفِ ناز و ادا کیوں نہ ہو یہ دل
ہر ہر ادائے حسن کہ صہبا کہیں جسے

اے چرخ لوٹ لے یہ مرا کاروانِ عیش
ہر لمحہ جس کا عشرتِ دنیا کہیں جسے

تاثیرِ آتشِ غمِ فرقت تو دیکھئے!
ہر نالہ وہ کہ آگ کا شعلا کہیں جسے

یارب نہ ڈوب جائے کہیں کشتیٔ حیات
سیلابِ اشک وہ ہے کہ دریا کہیں جسے

سجدے کہاں کہاں میں کروں اور کس طرح
ہر ذرہ ان کا نقشِ کفِ پا کہیں جسے

روشن ہے بزمِ دل مری فیضِ نگاہ سے
وہ داغِ دل چراغِ تمنا کہیں جسے

مجھ کو نہیں تلاشِ سکونِ دلِ فگار
اب درد بھی ہے وہ کہ شکیبا کہیں جسے

خود حسن بھی ہے محوِ تماشا یہ دیکھئے
دل کا وہ حال آتشِ سینا کہیں جسے

رِس رِس کے بہہ رہا ہے لہو دل کا آنکھ سے
ہر تارِ اشک وہ ہے کہ سہرا کہیں جسے

میں بھی ہوں اُن کی یاد بھی ہے شام ہجر بھی
بدبخت ایسا کون ہے مجھ سا کہیں جسے

کچھ بھی سوائے حسن کے آتا نہیں نظر
یہ وہ ہے طرفہ کاریِ سودا کہیں جسے

آغازِ عشق میں تو رہا آرزو کا گھر
اب دل کا رنگ وہ ہے تمنا کہیں جسے

وجدی بہ فیضِ حضرتِ محوی خدا گواہ
شاعر وہ کون ایسا ہے مجھ سا کہیں جسے

قاسم حسن

(مکرمی! السلام علیکم - یہ چند سطور حالاتِ حاضرہ کے ماتحت موجودہ ملّتِ اسلامی کے واقعی امراض، نقائص کے اسباب و علل اور ایسے دفاعی امور حالات کے سلسلہ میں پیش کی جارہی ہیں - امید ہے کہ میری یہ سعی ۔سعیِ مشکور ہو سکے ۔
وَمَا تَوفِیقِی اِلّا بِاللہِ -
قاسم حسن سکریٹری مسلم لیگ اچھاور
ریاست بھوپال)

دنیا بھر میں مسلمانوں کی زبوں حالی فقید المثال ہے۔ انفرادی طریق پر ہر ہر مسلمان اور اجتماعی طور پر ہر وہ جماعت جو مسلم افراد سے متعلق ہے اچھی طرح سمجھتی ہے کہ ان کا کردار کسی طرح مسلم کردار نہیں رہا ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو بھی اس کا احساس ہے۔ ضرورت ہے کہ موجودہ قعرِ ذلّت تک پہونچنے کے اسباب اور اس سے نجات حاصل کرکے صحیح معنوں میں مسلمان بن جانے کے لئے راستہ اور جس سر و سامان کار کی حاجت ہے اس کی تشریح کی جائے - تاریخ سے جہاں تک اندازہ ہوتا ہے دنیائے اسلام کا بیشتر حصہ اُن ممالک پر مشتمل ہے جو صدر اول کے مجاہدین کی کوششوں سے فتح ہوئے تھے ۔ وہ ملک گیری کے لئے نہیں بلکہ کلمۂ حق کو دنیا میں بلند کرنے کے لئے سروں سے کفن باندھ کر نکلے تھے ۔ وہ طلبِ دنیا کے بجائے طلبِ آخرت کے نشہ میں سرشار تھے۔ اس لئے اُنہوں نے اپنے مفتوحین کو مطیع و باجگزار بنانے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اُنہیں اسلام کے رنگ میں رنگ دیا۔ اپنے علم و عمل کی قوت نے ان میں اسلامی فکر و اسلامی تہذیب کو اتنا راسخ کر دیا کہ وہ خود تہذیبِ اسلامی کے علمبردار اور علومِ اسلامی کے معلّم بن گئے۔ اس کے بعد وہ ممالک ہیں جو اس عہد میں فتح ہوئے جبکہ اسلامی جوش سرد ہو چکا تھا اور فاتحین کے دلوں میں جہاد فی سبیل اللہ کے بجائے ملک گیری نے جگہ لے لی تھی لیکن اس کے باوجود بھی اسلام وہاں پھیلنے میں کامیاب ہو گیا۔ اور ان ممالک میں بھی اسلام نے قومی مدنیت اور قومی تہذیب کی جگہ حاصل کر لی۔ بدقسمتی سے ہمارے ملک ہندوستان کا معاملہ ہر دو اقسام کے ملکوں سے جُدا ہے - صدر اول میں اس کا بہت تھوڑا حصہ فتح ہوا تھا اور اس حصہ پر بھی جو کچھ اسلام کے اثرات پڑے تھے اسکو باطنیت کے سیلاب نے ختم کر دیا۔ اس کے بعد جب ہندوستان میں مسلمانوں کی فتوحات کا اصلی سلسلہ شروع ہوا تو فاتحان میں قرونِ اولیٰ جیسے مسلمانوں کی خصوصیات باقی نہیں تھیں۔ انہوں نے بجائے اشاعتِ اسلام کے ملک گیری میں اپنی قوت مرکوز کی اور لوگوں نے اطاعتِ خدا اور رسول کے بجائے اپنی اطاعت و باجگذاری کا مطالبہ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صدیوں کی حکومت و فرمانروائی کے بعد بھی بھارت کا سوادِ اعظم غیر مسلم رہا۔ اور صحیح معنوں میں نہ اسلامی تہذیب جڑ پکڑ سکی نہ اسلامی تمدن قائم ہو سکا۔

چونکہ اسلامی تعلیم وتربیت کا بھی کوئی خاص انتظام نہیں کیا گیا اس لئے نومسلم جماعتوں میں قدیم ہندوانہ خیالات رسم ورواج باقی رہے اور قدیم الایام مسلمان بھی اہل ہند کے میل جول سے مشرکانہ طرائق کے ساتھ رواداری برتنے اور جاہلانہ رسوم کی اتباع کرنے لگے۔

تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ جس زمانہ میں مسلمانوں کا ہندوستان پر سیاسی اقتدار چھایا ہوا تھا اس زمانہ میں بھی اسلام کے اثرات کمزور تھے اور یہاں کے عام مسلمان نیز مسلم حکومت کا ماحول خالص اسلامی ماحول نہ تھا اگرچہ اہل ہنود کا مذہب اور تمدن بالذات ضعیف اور کمزور تھا نیز محکوم ومغلوب ہو کر اور بھی کمزور ہو چکا تھا تاہم مسلمان عوام اور مسلم حکمرانوں کی رواداری اور اپنے مذہب سے غفلت نے مسلم تہذیب وتمدن میں اسے مخلوط ہو جانے دیا اور چونکہ مسلمانوں کی اسلامی تعلیم وتربیت مکمل نہ تھی اس لئے ان کا سواد اعظم اپنے عقائد میں اتنا صحیح وکامل مسلمان نہ ہو سکا جتنا وہ خالص اسلامی ماحول میں ہو سکتا تھا۔

اسلامی تہذیب کے لئے جو تھوڑا بہت سہارا مسلمانوں کے پاس سیاسی اقتدار کا تھا اٹھارھویں صدی میں وہ بھی ان سے چھن گیا پہلے مسلم اقلیت منتشر ہو کر چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہوئی پھر مرہٹوں، سکھوں اور انگریزوں کے سیلاب نے ان میں سے بیشتر کا خاتمہ کر دیا۔ اور ایک صدی سے زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ مسلمان اس سرزمین میں محکوم ومغلوب ہو گئے جس پر صدیوں حکومت کر چکے تھے۔ اب تھوڑی بہت رہی سہی صورت بھی ختم ہونے لگی۔ فارسی وعربی کے بجائے انگریزی ذریعہ تعلیم بن گئی۔ اسلامی قوانین منسوخ ہوئے۔ شرعی عدالتیں ٹوٹیں اسلامی قانون مسلمانوں کے حق میں صرف نکاح وطلاق تک محدود ہو گیا۔ اور وہ محدود اختیارات بھی غیر مسلم حاکموں کے سپرد ہو گئے۔ مزید یہ کہ ابتدا سے پالیسی رہی کہ مسلمانوں کی معاشی حیثیت کو بالکل کچل ڈالا جائے اور اس قومی فخر وناز کو مٹا دیا جائے جو حاکم قوم ہونے کی حیثیت سے صدیوں تک ان کے دلوں میں پرورش پاتا رہا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہی حاکم قوم صرف ایک صدی کے اندر مفلس، جاہل پست خیال، اور ذلیل ہو کر رہ گئی۔

اس گری ہوئی حالت پر ایک آخری ضرب ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں لگی اس نے مسلمانوں کی سیاسی قوت ہی کا خاتمہ نہیں کیا بلکہ ان کی ہمتوں کو توڑ دیا۔ ان کے دلوں پر مایوسی اور تذلیل کی تاریک گھٹائیں چھا گئیں اور ان کو اس جدید اقتدار نے اتنا مرعوب بنا دیا کہ ان میں اسلامی خودداری، اسلامی اسپرٹ تو باقی ہی نہ تھی قومی خودداری کا شائبہ بھی باقی نہ رہا اور ذلت وخواری کی انتہائی گہرائیوں میں پہنچ گئے۔

حکومت اور غلبہ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ذہنی اور اخلاقی غلبہ۔ دوسرا سیاسی اور مادی غلبہ۔ پہلی قسم کا غلبہ یہ ہے کہ ایک قوم اپنی فکری قوتوں میں اتنی ترقی کر جائے کہ دوسری قومیں، اس کے افکار پر ایمان لے آئیں۔ اسی کے تخیلات۔

معتقدات اور نظریات دماغوں پر چھا جائیں۔ اسی کی تہذیب تہذیب سمجھی جائے علم اس کا علم ہو تحقیق اس کی تحقیق ہو۔ وہ جس چیز کو باطل ٹھہرا دے باطل سمجھی جائے۔ دوسری قسم کا غلبہ یہ ہے کہ ایک قوم اپنی مادی طاقت کے اعتبار سے اتنی قوی ہو کہ دوسری قومیں اپنی سیاسی آزادی کو اس کے مقابل برقرار نہ رکھ سکیں۔ اور وہ کلی طور پر اُن کے وسائل ثروت کا بعض اور نظام مملکت پر حاوی ہو۔ اسی حیثیت سے مغلوبیت اور محکومیت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ذہنی مغلوبیت دوسری سیاسی مغلوبیت۔ یہ دو اوپر بیان کی ہوئی صفات کا عکس ہیں۔ اگرچہ یہ دونوں علٰحدہ علٰحدہ قسمیں ہیں لازم نہیں کہ جہاں ذہنی غلبہ ہو وہاں سیاسی غلبہ بھی ہو۔ لیکن قانونِ فطرت یہی ہے کہ جو قوم عقل و فکر سے کام لینی اور تحقیق و اکتشاف کی راہ میں پیش قدمی کرتی ہے اسکو ذہنی ترقی کے ساتھ مادی ترقی بھی نصیب ہو جاتی ہے۔ اور جو قوم تدبر و تفکر میں مسابقت کرنا چھوڑ دیتی ہے وہ ذہنی کمزوری کے ساتھ مادی انحطاط میں بھی مبتلا ہو جاتی ہے۔ اس لئے ضعیف و درماندہ اقوام اپنی درماندگی اور ضعف میں جس قدر ترقی کرتی جاتی ہیں اسی قدر غلامی و محکومی کی استعداد ان میں بڑھتی چلی جاتی ہے۔

مسلمانانِ ہند اس وقت اسی دوسری غلامی میں مبتلا ہیں۔ وہ پہلے سیاسی اور مادی طور پر غلام ہوئے اور آج ہر ایک فرد کا ذہن و دماغ غلامی کی لعنت میں مبتلا ہے۔ آج مسلمانوں کے مدرسے۔ ان کے دفتر۔ ان کے بازار ان کے گھر۔ ان کی سوسائٹی حتیٰ کہ ان کے جسم تک ان کی ذہنی و دماغی غلامی کا ثبوت دے رہے ہیں۔ ان پر غیروں کی تہذیب۔ غیروں کے افکار۔ غیروں کے علوم و فنون حکمراں ہیں۔ وہ ان ہی کے دماغوں سے سوچتے ان ہی کی عینکوں سے دیکھتے اور ان ہی کے بتائے ہوئے راستوں پر چلنا بڑے فخر و مباہات کی بات سمجھتے ہیں۔ اور اب یہ معاملہ اس حد کو پہونچ چکا ہے کہ وہ اپنے دین و ایمان۔ اپنی تہذیب و شائستگی۔ اپنے اخلاق و آداب کو بھی غیروں کے معیار پر ہی جانچتے اور اگر کوئی خیر بواہی اترتی ہے تو اسے بھی درست سمجھتے اور فخر کرتے ہیں۔

بحث یہ ہے کہ ذہنی غلبہ و استیلا کی بنیاد دراصل فکری اجتہاد و علمی تحقیق پر قائم ہوتی ہے۔ مسلمان جب تک تحقیق و اجتہاد کے میدان میں آگے بڑھتے رہے تمام دنیا کی قومیں ان کی پیرو اور مقلد رہیں۔ ان کی فکر سارے انسانوں کی افکار پر غالب رہی۔ حسن و قبح۔ نیکی بدی۔ غلط اور صحیح کا جو معیار اسلام نے قائم کر دیا دنیا کی ہر قوم میں وہی معیار صحیح قرار پایا۔ لیکن جب مسلمانوں نے کلام ربانی اور اسوۂ رسول اکرمؐ سے منھ موڑا ان میں ارباب فکر و تحقیق پیدا ہونا بند ہو گئے۔ جب انہوں نے فکر و جستجو کرنا اور معلومات حاصل کرنا چھوڑ دیا۔ جب وہ اکتساب علم و اجتہاد و فکری سے بھٹک کر بیٹھ گئے تو گویا انہوں نے خود دنیا کی رہنمائی سے استعفیٰ دیدیا۔ اس وقت سے برابر ضلالت اور گمراہی میں مبتلا ہوتے چلے گئے جس میں آج دنیا کی پست سے پست اقوام بھی

پائی نہیں جاتیں۔

مسلمانوں کی موجودہ حالت یہ ہے کہ وہ بوجہ فقدان علم القرآن وحدیث یہ سمجھنے پر مجبور ہیں کہ دنیا میں سلامتی حاصل کرنے کا ذریعہ انگریزی کی خدمت اور ترقی حاصل کرنے کا ذریعہ انگریز کی تقلید ہے۔ اور ان کا اپنا سرمایۂ علم وتہذیب کچھ بھی نہیں۔ اب جو اٹھنے اور سنبھلنے کی کوشش کرتے ہیں تو انھیں ان کی یہ زبردست کمزوری اُٹھنے نہیں دیتی۔ فکروعمل کے اعتبار سے تو وہ پہلے ہی اسلامی تہذیب وعقائد سے واقف نہ تھے اب ایک غیر اسلامی ماحول انھیں چار طرف سے گھیرے ہوئے تھے۔ پھر غلامی کی لعنت اپنی تمام مصیبتوں کے ساتھ اُن کے جسم اُن کے قلب وروح تک پر مسلط ہو چکی ہے معاشی بدحالی نے انھیں بتایا کہ انگریزی حکومت نے اپنی ہوشمندی سے معاشی ترقی کے تمام دروازے مسدود کر رکھے ہیں اور ان کی کنجی صرف انگریزی مدرسوں اور کالجوں میں ہے۔ اُنہوں نے اس طرف توجہ کی۔ اس تعلیم کے اثرات جو کچھ ہو سکتے تھے وہ پیدا ہوئے اور نتیجہ میں مسلمان اسلام سے دور ہوتے چلے گئے۔

یورپ میں اٹھارھویں صدی ہی میں سائنس پوری طرح مذہب کو شکست دے چکا تھا اور مادیت پورے عروج پر تھی جدید فلسفہ اور نئے علوم حکمت کی راہ نمائی میں سیاسیات، معاشیات، اخلاقیات کے پرانے اور مذہبی نظریے باطل قرار دیکر نئی ترکیب قائم ہو چکی تھی۔ اور بالکل جدید اور ایک خاص تہذیب پیدا ہو چکی تھی۔ خدا سے بیزاری۔ اُسکے وجود سے انکار۔ کائنات کو مادہ اور قوانین طبعی کے ماتحت چلنے والی چیز سمجھنا۔ مذہبیت کو لغو اور مذہب کو تنگ نظری سمجھنا فیشن میں داخل ہو چکا تھا۔ ہر شخص خواہ وہ فلسفہ وحکمت سے دور کا تعلق بھی نہ رکھتا ہو ان حالات کا اظہار اس لئے کرنا ضروری سمجھتا تھا کہ سوسائٹی میں روشن خیال سمجھا جائے۔ اس نئے تمدن وتہذیب کے زیر سایہ ہندوستان میں تعلیم انگریزی آئی۔ اور ہم نے تعلیم پائی۔ انگریزی حکومت اور ان کی اس تہذیبِ جدید کا حلقہ غلامی تو پہلے ہی سے پڑا ہوا تھا اب جو اس جدید فضا میں قدم رکھا تو ذہنیت کا سانچہ بھی بدلا اور طبیعت کا رُجحان مذہب سے ہٹ گیا۔ یورپ کے کسی محقق کی جانب سے جب کوئی چیز سامنے آئی یقین کامل کے ساتھ دل کی گہرائی تک اُتر گئی۔ کیونکہ انسانی طبیعت فطرتاً اثر پذیر واقع ہوئی ہے اور جب وہ مختلف مدارج کے ساتھ متعدد طرائق سے اثر اندوز ہو جائے تو پھر غلط سے غلط اور بد سے بدتر چیز کو بھی بہتر سمجھتی اور قبول کر لیتی ہے۔ چونکہ اس تعلیم جدید کے اصول وفروع اکثر وبیشتر اسلام کے اصول وجزئیات کے خلاف تھے۔ جیسا کہ جدید تہذیب میں مذہب کا تصور ایک شخصی اعتقاد ہے اور جس کا عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ اسلام میں مذہب پوری زندگی کا قانون ہے۔ یہاں پہلی چیز ایمان باللہ ہے تہذیب جدید میں اللہ کا وجود ہی (نعوذ باللہ) مسلّم نہیں۔ اسلام کا اصل الاصول یہ ہے کہ خدا خود واضع قانون اور رسول شارح قانون، انسان صرف متبع قانون مگر تہذیب جدید میں خدا کو وضع قانون کا سرے سے کوئی حق ہی نہیں لیجسلیچر واضع قانون اور قوم لیجسلیچر کو منتخب کرنے والی غرض ہر ہر معاملہ میں نمایاں اختلاف

جدید سیاست کا راستہ بالکل جدا اسلام کا بالکل جدا۔ اور یہ کیوں ہے کہ دونوں کے اصول مختلف ہیں نتیجہ وہی نکلا جو آج پیش نظر ہے۔ حقیقتاً جدید تعلیم اور جدید طریقہ تعلیم نے سیاسی و معاشی حیثیت سے ہندوستان کے مسلمانوں کو خواہ کچھ بھی فائدہ پہونچایا ہو مگر ان کے مذہب، ان کی تہذیب کو جو کچھ نقصان پہونچایا اس کی تلافی کسی فائدے سے نہیں ہوسکتی۔

اس نئی اور جدید تہذیب کی گمراہی کے ثبوت میں لارڈ لوتھین کی تقریر کے بعض اقتباسات درج کئے جاتے ہیں۔ موصوف نے یہ تقریر علی گڈھ یونیورسٹی کے جلسۂ تقسیم اسناد جنوری ۱۹۳۸ء میں پڑھی تھی۔ موصوف لکھتے ہیں۔

"یہ امر تنقیح طلب ہے کہ آیا ہندوستان دورِ جدید کی سائنٹفک اور عقلی تعلیم کے اس شدید نقصان سے بچ سکتا ہے جس میں یورپ و امریکا آجکل مبتلا ہیں۔ مغرب میں حکمت جدیدہ سے دو بڑے نتیجے رونما ہوئے ہیں۔ ایک طرف تو اس نے فطرت اور اس کی طاقتوں پر انسان کی دست رس کو بہت زیادہ وسیع کر دیا ہے۔ دوسری طرف اس نے یونیورسٹی کے تعلیم پائے ہوئے لوگوں میں اور عموماً ساری ہی دنیا میں متوارث مذہب کے اقتدار کو کمزور کر دیا۔ دنیائے جدید کی کم از کم آدھی خرابیاں در اصل ان ہی دو اسباب سے پیدا ہوئی ہیں۔ تہذیب یافتہ آدمی ان طاقتوں کے نشہ میں چور ہوگیا ہے جو سائنس نے اس کو فراہم کر دی ہیں۔ مگر اس نے علم و تمدن کی ترقی کے ساتھ اخلاق میں مساوی ترقی نہیں کی جو اس بات کی ضامن ہوسکتی تھی کہ یہ طاقتیں انسان کی تباہی کے بجائے اس کی بھلائی کے لئے استعمال ہوں۔"

لارڈ لوتھین۔ ہندوستانی یا ایشیائی نہیں۔ وہ پیدائشی اور خاندانی یوروپین ہے۔ اس نے اسی جدید تہذیب کے آغوش میں جنم لیا ہے۔ اور زندگی کے پورے دن اسی جدید تمدن میں گذارے ہیں۔ آکسفورڈ کا اعلیٰ تعلیم یافتہ راؤنڈ ٹیبل جیسے مشہور رسالہ کا ایڈیٹر رہ چکا ہے۔ اور عرصہ سے سلطنتِ برطانیہ کے مہمات امور میں حصہ لیتا رہا ہے۔ وہ باہر سے دیکھنے والا نہیں بلکہ مغربی تہذیب کے گھر کا آدمی — آگے چل کر اور وضاحت کرتا ہے۔

"سائنٹفک اسپرٹ (روح تحقیق) نے یہ تو ضرور کیا کہ رفتہ رفتہ اس نے پرانے توہمات کو دور کر دیا علم کے دائرے کو پھیلا دیا اور اس طرح مردوں اور عورتوں کو ان بہت سی قیود سے آزاد کر دیا جن میں وہ پہلے جکڑے ہوئے تھے۔ مگر اس کے ساتھ اس نے یہ بھی کیا کہ انسان کو روحانی و مذہبی صداقت کا شدت کے ساتھ حاجتمند بنا کر چھوڑ دیا اور اس صداقت تک پہونچنے کا کوئی راستہ فراہم نہیں کیا۔ اکثر اہلِ مغرب کا یہ حال ہے کہ وہ بچوں کی طرح تیز رفتار ہیں اور جو اس کی لذتوں کے شوق میں منہمک ہیں۔ سادہ زندگی بسر کرنے کی صلاحیت ان سے سلب ہوگئی ہے اور عملاً ان کا کوئی ربط اس لامحدود ازلی و ابدی حقیقت سے باقی نہیں رہا جسے مذہب پیش کرتا ہے۔ مذہب جو انسان کا ناگزیر رہنما اور انسانی زندگی کو اخلاقی مقصد شرف حاصل کرنے کا واحد ذریعہ ہے اس کے اقتدار میں زوال آجانے کا نتیجہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مغربی دنیا ان سیاسی ملکوں کی گرویدہ ہوگئی ہے جو نسلی یا طبقاتی بنیادوں پر قائم ہیں اور سائنس کی اس

ورت پر ایمان لے آئی ہے جو محض مادی طریقہ کو منتہائے مقصود قرار دیتی ہے۔ اور زندگی کو روز بروز پیچیدہ و گراں بار بناتی لی جا رہی ہے پھر یہ بھی اسی کا نتیجہ ہے کہ یورپ کے لئے اپنی روح و اپنی زندگی میں اُس اتحاد کا پیدا کرنا دشوار ہو رہا ہے جو اس کو وجودہ دور کے نیشنلزم سے نجات دلائے"

لارڈ لوتھین کے خطبہ کا یہ حصہ پڑھکر تعلیم یافتہ طبقہ اس کا اندازہ کر سکتا ہے کہ جس تہذیب و تمدن نے صحیح و غیر متزلزل رہنما کو چھوڑ دیا خود اُسی تہذیب و تمدن کے تعلیم یافتہ انسان کا اس تہذیب و تمدن کے متعلق کیا خیال ہے۔ جو لوگ مذہب اسلام کا اندرونی علم رکھتے ہیں اُن سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ روح تنقید و تحقیق کے مقابلہ میں اگر کوئی مذہب ٹھہر سکتا ہے تو بلکہ صحیح طور پر اگر کوئی مذہب اس روح کے ساتھ اپنے متعلقہ لوگوں کو ساتھ لیکر آگے بڑھ سکتا ہے اور اس دور روشنی و ترقی میں پوری نوعِ انسانی کا مذہب بن سکتا ہے تو وہ اسلام کے سوا کوئی نہیں ہے۔ مسیحیت صرف اس وجہ سے ناکام ہوئی کہ وہ کوئی اجتماعی لمذہ ؟ مسلک نہیں بلکہ اجتماعیت کا نفی ہے۔ اس کو صرف فرد کی نجات سے بحث ہے۔ ہندوازم کے پاس بھی کوئی ترقی پرور فلسفہ اور کوئی عقل قانونِ اخلاق اور کوئی وسعت پذیر نظامِ اجتماعی نہیں ہے۔ سب سے بڑی طاقت جس نے اب تک ہندوؤں کو ایک سوشل سسٹم (social system) میں باندھے رکھا۔ اور دوسری تہذیبوں سے کم اثر اندوز ہونے دیا وہ ان کا ورن آشرم ہے (cast system) مگر موجودہ دور کی روح تنقید و تحقیق نے اسے توڑنا اور ختم کرنا شروع کر دیا ہے۔ چھوت چھات اب تعلیم یافتہ ہنود کے یہاں برائے نام اور محض قدامت پسندی کی یادگار کے طور پر باقی ہے۔ ان کے بڑے بڑے لیڈر اس ورن آشرم کو اب اپنی ترقیِ مدارج کا روڑا خیال کرنے لگے ہیں۔ اور آج بڑے زور شور سے ہندو اکابرین قوم اچھوت اپدھار کا پرچار کر رہے ہیں یہاں تک کہ مسٹر گاندھی نے تو بھنگی بستی ہی میں رہن سہن اختیار کر لیا ہے۔ بہ لحاظ حالات اس ورن آشرم کے شکست ہو جانے کے بعد بہت سے بندھن ہندو سوسائٹی کے ٹوٹ جائیں گے۔ اور پھر وہ بہت جلد بیرونی اثرات قبول کرے گی کیونکہ ہندوؤں کے قدیم قوانینِ معاشرت و تمدن اور اُن کے بُت پرستانہ توہمات۔ غیر عقلی و غیر علمی فلسفیانہ قیاسات دورِ جدید کی سائنٹفک اسپرٹ نیز علمی ترقی و اجتماعی بیداری کے ساتھ نہیں ٹھہر سکتے جس کا اندازہ روز بروز ہوتا چلا جا رہا ہے۔

بہرحال اسلام اور اسلامی اصول ہی ایسے ہیں جو سائنٹفک تحقیق و تدقیق کی کسوٹی پر صحیح اترے ہیں۔ لیکن اسلام صرف نام سے تو کوئی معجزہ نہیں دکھا سکتا اس کے اصول اگر کتاب ہی میں موجود رہیں تو بھی کسی معجزہ کا صدور ممکن نہیں۔ جس انتشار اور بے علمی کے عالم میں مسلمان آج مبتلا ہیں اور جو جمود ان کے علماء پر طاری ہے اور جس انفعال و تأثر کا صدور ان کے تعلیم یافتہ طبقہ سے ہو رہا ہے اس سے ہندوستان کی روح کو فتح کرنا تو دشوار ہے بلکہ یہ بھی توقع نہیں کی جا سکتی کہ اسلام کے یہ نام نہاد نام لیوا بھی اپنی جگہ قائم رہ سکیں گے۔ ظاہر ہے کہ انقلاب کے تیز رو سیلاب میں کسی جماعت کا ساکن کھڑا رہنا

تو غیر ممکن ہے۔ یا اس کی رَو میں بہنا پڑیگا یا پھر پوری مردانگی کے ساتھ اٹھ کر سیلاب کا منہ پھیر دینا ہوگا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عام مسلمانوں کی اخلاقی حالت درست کی جائے اور ان میں اسلامی زندگی کی روح پیدا کی جائے علمائے اسلام اور نئے تعلیم یافتہ مسلمان مل کر اصولِ اسلام کے مطابق زندگی کے جدید مسائل کو سمجھیں اور علمی و عملی طور پر ان کو اس طور پر عمل کر کے بتائیں کہ اندھے متعصبین کے سوا ہر معقول انسان کو تسلیم کرنا پڑے کہ ایک ترقی پذیر تمدن کے لئے اسلامی تہذیب کے سوا اور کوئی اساس صحیح اور بے عیب نہیں ہو سکتی۔ اسلام حقیقت میں ایسا ہی مذہب ہے اور آج سائنس کی روح بننے سے اگر کوئی چیز روکے ہوئے ہے تو وہ اس کا اندرونی نقص نہیں بلکہ اس کے علمبرداروں کی غفلت اور موجودہ سائنس کے علمبرداروں کا جہل اور جاہلانہ تعصب ہے۔

انقلاب انگیز جد و جہد ایک مبہم لفظ ہے جس کی عملی صورتیں بہت سی ہیں اور بہت سی ہو سکتی ہیں جس قسم کا انقلاب برپا کرنا مقصود ہوتا ہے اس کے لئے وہی صورتیں اختیار کرنی پڑتی ہیں جو اس انقلاب کی فطرت سے مناسبت رکھتی ہوں۔ مسلمانوں کو کسی جدید انقلابی صورت اختیار کرنے کی ضرورت نہیں نہ تلاش و جستجو سے کوئی نئی ترکیب پیدا کرنا ہے۔ بلکہ صرف وہی انقلاب برپا کرنا ہے جو آج سے تیرہ سو پینسٹھ (۱۳۶۵) برس پہلے برپا ہو چکا ہے۔ جس پاک اور عظیم المرتبت ہستی نے وہ انقلاب برپا کیا تھا وہی اس کی فطرت کو خوب جانتا تھا اور اسی کے اختیار کئے ہوئے طریقہ کی پیروی کر کے آج بھی ایک انقلاب برپا کیا جا سکتا ہے۔ اس انسان اکبر (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جو نمونہ چھوڑا ہے اسی کا طبعی خاصہ انقلاب انگیزی ہے۔ اس نمونہ کی جتنی زیادہ مماثلت پیدا کی جائے گی اسی قدر زیادہ انقلاب انگیز نتائج پیدا ہونگے اور برآمد ہوتے چلے جائیں گے۔ چنانچہ تاریخ اس دور کے واقعات پر روشنی ڈالتی ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم جب دنیا میں تشریف لائے تو تمام دنیا پر شرک و کفر کا غلبہ تھا؟ کیا استبداد اور ظلم کی حکومت نہ تھی۔ کیا اخلاق پر فواحش اور معاشرت پر نفس پرستی کا تسلط نہ تھا؟ مگر ایک تنِ واحد نے اٹھکر تمام دنیا کو چیلنج دیدیا اور بہت ہی قلیل عرصہ میں زمانہ کے رُخ کو پلٹ دیا۔ تازہ ترین خیال اشتراکی تحریک ہے۔ سرمایہ داری کا تسلط اپنی انتہا کو پہنچ گیا تھا کوئی متنفس بھی اسوقت یہ تصور نہیں کر سکتا تھا کہ جو نظام اس ہیبت ناک طریق پر دنیا بھر میں مسلط ہے اُسکو الٹ دینا بھی ممکن ہے۔ ایسے ہی حالات میں ایک شخص کارل مارکس اٹھا اس نے اشتراکیت کی تبلیغ شروع کی۔ حکومتوں نے اس کی مخالفت شروع کی۔ وطن سے نکالا گیا۔ در بدر کی خاک چھانتا پھرا۔ مصیبت اور تنگدستی سے دوچار رہا مگر مرنے سے پہلے اشتراکیوں کی ایک طاقتور جماعت پیدا کر گیا۔ جس نے صرف چالیس سال کے اندر نہ صرف روس کی سب سے بڑی طاقت کو اُلٹ کر رکھ دیا بلکہ تمام دنیا میں سرمایہ داری کی جڑوں کو ہلا کر رکھ دیا۔

پیروی طریق کی دعوت کا مفہوم کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ ہم کو صرف ظاہری اشکال میں مماثلت پیدا کر لینی چاہئے

اور دنیا اس وقت جس دورِ تمدن سے گزر رہی ہے اس سے رجعت کر کے ساڑھے تیرہ سو برس پیچھے چلے جائیں۔ پیروی و اتباع رسول وصحابہ رسول کا یہ مفہوم ہی سرے سے غلط ہے۔ اسلام کی یہ تعلیم ہرگز نہیں ہے کہ جیتے جاگتے آثارِ قدیمہ بن جائیں۔ وہ ہمیں رہبانیت اور قدامت پسندی نہیں سکھاتا اس کا مقصد دنیا میں ایک ایسی قوم پیدا کرنا نہیں ہے جو تغیر و ارتقا کو روکنے کی کوشش کرتی ہے بلکہ اس کے بالکل برعکس وہ ایک ایسی قوم بنانا چاہتا ہے جو تغیر و ارتقا کو غلط راستوں سے پھیر کر صحیح راستے پر چلانے کی کوشش کرے۔ وہ ہم کو دولت کے بجائے روح عطا کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ کائنات کے تغیرات سے زندگی کے جتنے بھی دور قیامت تک پیدا ہوتے چلے جائیں اُن سب میں ہم یہی روح بھرتے چلے جائیں۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے دنیا میں ہمارا اصلی مشن یہی ہے ہم کو خَيْرَ أُمَّةٍ جو بنایا گیا ہے تو یہ اس لئے نہیں کہ ہم ارتقائے عالم کے راستہ میں آگے بڑھنے والوں کے پیچھے عقب لشکر کی حیثیت سے لگے رہیں بلکہ ہمارا کام امامت و رہنمائی ہے ہم مقدمۃ الجیش بننے کے لئے پیدا کئے گئے ہیں اور ہمارا یہ راز أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ میں پوشیدہ ہے۔

اُسوۂ رسول اکرم وصحابہ رضوان جن کی پیروی ہمیں کرنی چاہئے یہ ہے کہ جس طرح انہوں نے قوانین طبعی کو قوانین شرعی کے تحت استعمال کیا اس عہد کے تمدن میں اسلامی تہذیب کی روح پھونک کر جس طرح خدا کی خلافت کا پورا پورا حق ادا کیا اور غلبہ و ترقی کے جس قدر وسائل زمانہ نے فراہم کر رکھے تھے ان سے کام لینے میں وہ کفار و مشرکین سے سبقت لے گئے تاکہ خدا سے بغاوت کرنے والوں کی تہذیب سے خدا کی خلافت سنبھالنے والوں کی تہذیب کامیاب ہو اور اسی چیز کی تعلیم ان کو قرآن کے ذریعہ دی گئی تھی أَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ ان کو بتایا گیا تھا کہ خدا کی پیدا کی ہوئی قوتوں سے کام لینے کا حق کافر سے زیادہ مسلم کو پہونچتا ہے۔ پس نبی کریم کا اتباع و پیروی یہ ہے کہ زمانہ کے ارتقا اور قوانین طبعی کے اکتشافات سے جو وسائل اب پیدا ہوئے ہیں ان سب کو ہم تہذیب اسلامی کا خادم بنانے کی کوشش کریں جس طرح صدر اول نے کی تھی۔ گندگی اور برائی ان وسائل میں نہیں بلکہ اس کافرانہ تہذیب میں ہے جو ان وسائل سے فروغ پا رہی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں کا سوادِ اعظم اب بھی اسلام کی صداقت پر ایمان رکھتا اور مسلمان بننا اور مسلمان رہنا چاہتا ہے۔ لیکن دماغ غیروں کے افکار و تہذیب کے غلام ہو چکے ہیں اور ہمارے زاویۂ نگاہ اس طرح بدل گئے ہیں کہ آج اسلامی نظر سے دیکھنا اور اسلامی طریق پر سوچنا دشوار ہو گیا ہے۔ یہ ہماری ذہنی غلامی اس وقت تک دور نہیں ہو سکتی جب تک ہم میں آزاد مسلم اہل فکر پیدا نہ ہوں۔ جو اپنی تحقیق و اکتشاف کی قوت سے ان بنیادوں کو ڈھا دیں جن پر غیروں نے مادی عمارت قائم کر رکھی ہے۔ قرآن کریم کے بتائے ہوئے طریق فکر و نظر پر۔ آسار کے مشاہدہ اور حقائق کی جستجو سے ایک نئے نظام کی بنیاد رکھیں جو خالص اسلامی فکر اور اُسوۂ رسول اکرم کا نتیجہ ہو۔

یقیناً جب تک ہمارے ذہن و دماغ اور ان کے افکار و حقائق اس مادی مغلوبیت اور محکومیت سے نجات پائیں گے ہمارے کردار میں کوئی انقلاب پیدا نہیں ہو سکے گا۔ اس وقت ضرورت ذہنوں اور دماغوں کو غلامی سے نجات دلا سکتی ہے نہ کہ اجسام کو وقت کا سب سے بڑا کام تجدید ملت ہے کیونکہ نئی روح تحقیق نے بے شمار نئے رسائل کے ساتھ بے حساب مسائل زندگی پیدا کر دئے ہیں جن کا وہم تک دماغوں میں نہ تھا صرف اللہ جل جلالہٗ کے علم اور اس کی بخشش و فضل و کرم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بصیرت ہی پر یہ حالات روشن تھے لہٰذا کتاب اللہ و سنت رسول اللہ ہی وہ تنہا ماخذ ہے جس سے اس دورِ جدید میں تجدید ملت کا کام کرنے کے لئے راہ نمائی حاصل کی جا سکتی ہے

یہاں ایک پیشن گوئی لکھی جاتی ہے جو نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے کلام میں موجود ہے۔ یہ روایت شاطبی نے موافقات میں اور مولانا اسمٰعیل شہید نے منصب امامت میں نقل کی ہے۔

(۱) ان اول دینکم نبوۃ و رحمۃ وتکون فیکم ماشاء اللہ تکون ثم یرفعہا اللہ جل جلالہ

(۱) تمہارے دین کی ابتدا نبوت و رحمت سے ہے اور وہ تمہارے درمیان رہیگی جب تک اللہ چاہے گا پھر اللہ جل جلالہٗ اس کو اٹھا لے گا۔

(۲) ثم یکون خلافۃ علی منہاج النبوۃ ماشاء اللہ تکون ثم رفعہا اللہ جل جلالہ

(۲) پھر نبوت کے طریقہ پر خلافت ہوگی جب تک اللہ چاہے گا پھر اللہ جل جلالہٗ اسے بھی اٹھا لے گا۔

۳۔ ثم تکون ملکاً عاضاً فیکون ماشاء اللہ ان یکون لہ یرفعہا اللہ جل جلالہ

(۳) پھر بد اطوار بادشاہی ہوگی اور جو کچھ اللہ چاہے گا وہ ہوگا۔ پھر اللہ جل جلالہٗ اسے بھی اٹھا لے گا۔

۴۔ ثم یکون ملکاً جبریۃ فیکون ماشاء اللہ ان تکون ثم یرفعہا اللہ جل جلالہ

(۴) پھر جبر کی فرمانروائی ہوگی اور وہ بھی جب تک اللہ چاہے گا رہے گی پھر اللہ جل لہٗ اسے بھی اٹھا لیگا۔

۵۔ ثم تکون خلافۃ علی منہاج النبوۃ تعمل فی الناس بسنۃ النبی ویلقی الاسلام بجرانہ فی الارض رضی عنہم ساکن السماء وساکن الارض لا تدع السماء من قطر لاصبتہ ولا تدع الارض من نباتہا و برکاتہا الا اخرجتہ

(۵) پھر وہی خلافت بطریق نبوت ہوگی جو لوگوں کے درمیان نبی کی سنت کے مطابق عمل کرے گی اور اسلام زمین میں پاؤں جمائے گا اس حکومت سے آسمان والے بھی راضی ہوں گے اور زمین والے بھی آسمان دل کھول کر اپنی رحمتوں کی بارش کرے گا اور زمین اپنے پیٹ کے سارے خزانے اُگل دے گی۔

اس روایت میں تاریخ کے پانچ مرحلوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ جن میں سے تین گزر چکے ہیں اور چوتھا گزر رہا ہے۔

مسٹر گریزی تخیل آبادی

گریزی

ان کو آشفتہ مزاجوں کے جنوں سے کیا کام
وہ سنوارا کریں بیٹھے ہوئے گیسو اپنا

ناز! ٹھیک تو ہے۔ آشفتہ مزاجوں کا جنون ہے کس کام کا۔ جس کو گیسو سنوارنے پر ترجیح دی جائے۔ حالتِ جنون میں انسان بے ہوش ہوتا ہے اور بے ہوش کی طرف توجہ کرنا ہوش والوں کا کام کہاں؟ حالانکہ سننے میں یہ آیا ہے کہ "دیوانہ باش تا غمِ تو دیگراں خورند   آنرا کہ عقل بیش غمِ روزگار بیش" اب ماہوش بے ہوش کی طرف توجہ نہیں کر سکتا، اس لئے شعر اپنی جگہ درست ہے۔ لیکن دیوانہ ہونا اپنے بس کی بات تو ہے نہیں۔ آشفتہ مزاجی کی انتہا جنون اور جنون کی منتہا دیوانگی پر ہوتی ہے۔ آشفتہ مزاجی تخیلی دیوانگی بنتی ہے۔ تخیلی دیوانگی نتیجہ ہے ظاہری اثرات کے قبول کر کے تخیل پیدا کر لینے کا اور کامیاب اُس وقت ہوتی ہے جبکہ ظاہری تصویر نگاہوں سے اتفاقی یا ارادی طور پر مدہم ہوتی چلی جائے۔ مدہم ہونے سے آشفتہ مزاج میں حرارت پیدا ہوگی اور وہ بحالتِ یاس چلائے گا "ہائے کیا جانے وہ اب کیوں یاد آتے ہیں مجھے"۔ یہ بے نیازی دکھلاوٹ کی ہوگی، اور وہ جتنا چلائے گا اُتنی ہی آشفتہ مزاجی بڑھے گی۔   حدود سے متجاوز ہونے پر جہالت، جنون وغیرہ پیدا ہوکر دیوانگی طاری ہوگی اور وہ گھبرا کر کہے گا "کشمکش ہائے الم سے اب یہ حسرت جی میں ہے   چھٹ کے ان جھگڑوں سے مہمانِ قضا ہو جائیے" اور ناز اُس وقت بھی توجہ نہ کرے گی۔ کیوں؟ گیسو سنوارنا دلیل ہے اس بات کی کہ گیسو بکھرے ہوئے ہیں جنھیں سنوارنے کی ضرورت ہے۔ سنوارنا بالارادہ ہوتا ہے۔ ارادہ کے عمل میں استغراق ہوتا ہے۔ استغراق منافی ہے توجہ دینے اور کرنے کا تو پھر کیسے ممکن ہے کہ گیسو سنوارتے وقت آشفتہ مزاج کی طرف توجہ کی جائے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ آشفتہ مزاج کی بڑھتی ہوئی وحشت کو دیکھ کر ایک قہقہہ لگا دیا جائے اور بے نیازی کے ساتھ پھر اپنے کام میں مشغول ہو جایا جائے۔ قہقہہ میں استہزا، غم اور مسرت سب کچھ ہو سکتے ہیں۔ استہزا صوت ہے انسانی فطرت کی۔

(ملاحظہ ہو صفحہ ۶۲)

حضرت حفظی

مصوّر کی موت

ہم سب ایک جگہ رہا کرتے تھے۔ سب مختلف الخیال تھے۔ سب کے مشغلے جدا تھے۔ پھر بھی ہم سب میں یگانگی بہت تھی۔ ہم سب ایک دوسرے کے ساتھی تھے۔ ساتھی۔ حسد و بغض سے دور۔ درد و غم کے شریک۔ قیامت سے پہلے اور قیامت میں کام آنے والے ساتھی۔ راحت و مسرت پر خوش ہونے والے ساتھی۔ ہم سب میں اخلاص و محبت کا رابطہ تھا۔ ہم رشتہ دار نہ تھے۔ میں سرکاری ملازم تھا۔ ملازم۔ مقید زبان بندی و فعل بندی۔ سرکاری نگاہوں سے دیکھنے والا۔ سرکاری کانوں سے سننے والا۔ سرکاری زبانوں سے بولنے والا اور سرکاری خیال رکھنے والا۔ ایک کاشتکار تھا۔ کاشتکار متوکل، بے پروا۔ خود دار۔ آزاد۔ بے فکرا۔ ایک تاجر تھا۔ تاجر۔ حریص۔ سرمایہ دار۔ ہر بات کو فائدہ اور نقصان کی نگاہوں سے دیکھنے والا۔ ایک شاعر تھا۔ شاعر۔ متفکر۔ حسّاس۔ بے عمل۔ ایک مصوّر تھا۔ مصوّر۔ بے نیازِ ہر دو عالم۔ مغیّر۔ حسّاس۔ آزاد۔ غافل۔ حُسن کا متلاشی۔ قبح سے ناواقف۔ حُسن کو نہ جاننے والا۔ ہزاروں معشوق بنانے والا۔ عاشق نہ ہونے والا۔ اُس نے بہت سی تصویریں بنائیں لیکن ناکامیاب رہا۔ ناکامیاب اس لئے کہ ملازم کے لئے بے سود۔ تاجر کو غیر مفید۔ کسان کو بے کار۔ شاعر کو جذبہ نہ دینے والی۔ لیکن خود اُس کے لئے ہر تصویر ایک شاہکار زندگی تھی۔ وہ خود اُن کو دیکھتا اور گھنٹوں دیکھتا سوچتا رہتا۔ زندگی کی وہ تصویر ملازم، تاجر، کسان، شاعر، سب کے لئے بیکار تھی۔ وہ سب کشمکش حیات میں مبتلا تھے۔ وہ صرف زندہ تصویر کی قدر کرسکتے تھے۔ مصور ان تصویروں کو بھی زندہ کہا کرتا تھا۔ وہ مفلس بھی تھا۔ مفلس کا ہنر، اچھا ہنر بھی کم قیمت ہوتا ہے۔ اُس نے امید نہ کھوئی تھی۔ وہ دولت کی تلاش میں تھا۔ اس لئے تھا کہ وہ ایک باکمال مصوّر ہوسکے گا۔ اُس کی کوششیں جاری تھیں۔ وہ بقائے دوام حاصل کرنے کا متمنّی تھا۔ وہ ایک غیر فانی شاہکار تیار کرنا چاہتا تھا، ایک دن۔

ایک راجہ ایک پالکی میں سوار جسکو سولہ دو پائے یا انسان اپنے کاندھوں پر اُٹھائے

لئے جارہے تھے، جارہا تھا یا لیجایا جارہا تھا۔ دو شخص راجہ کے سر پر پشت سے مورچھل جھل رہے تھے۔ راجہ کی صورت نظر نہ آتی تھی۔ سڑکیں بالکل صاف رکھی گئیں تھیں۔ سڑک کے ہر دو جانب پولیس کے جوان اسلئے ایستادہ تھے کہ کوئی شخص سڑک پر نہ آجائے۔ آگے آگے زرّیں بینڈ اس کے پیچھے فوج کے علمبردار گھوڑوں پر زرّیں لباس پہنے جارہے تھے۔ پھر پیدل فوج کے دستے تھے۔ اس کے پیچھے راجہ کی سواری اس شان سے جارہی تھی کہ غرفہ کے چاروں طرف دولتمند بیش بہا لباس پہنے ہوئے سرداروں اور درباریوں کی قطاریں تھیں۔ پالکی کے پیچھے بھی فوج تھی۔ اور ان کے پیچھے عوام کا ہجوم۔ یہ سب اس طرح جارہے تھے جس طرح کسی جنازے کے ساتھ جانا ہو۔ خاموش، سنجیدہ۔ آہستہ۔ خراماں۔

سڑک کے ایک موڑ پر کچھ بچے کھیل رہے تھے۔ راجہ کی آمد کا شور ہوا۔ عام انسانوں کا ہجوم پولیس کے جوانوں کے پیچھے آکر کھڑا ہو گیا۔ بچے بھی آگئے۔ وہ اُچھل اُچھل کر دیکھنے لگے۔ راجہ نظر نہ آیا۔ ایک بچے نے سوال کیا۔ "ہمارا راجہ کہاں ہے"؟ کسی نے جواب دیا۔ "پالکی کے اندر"۔ "کیا وہ عورت ہے"؟ "نہیں وہ مرد ہے۔ وہ راجہ ہے"۔ "اس پالکی کو کون لئے جارہا ہے"؟۔ "غلام"۔ "کیا ہمارے راجہ کے پیر نہیں ہیں جو وہ پالکی میں جارہا ہے"؟۔ "نہیں" اس کے پاؤں ہیں۔ وہ راجہ ہے"۔ "وہ پردہ میں کیوں ہے؟ وہ سامنے کیوں نہیں آتا؟۔ کیا وہ ڈرتا ہے؟" "نہیں وہ ڈرتا نہیں"۔ وہ پردہ میں سے سب کو دیکھتا ہے۔ وہ راجہ ہے۔ کیا یہ غلام جانور ہیں؟ جو زندہ آدمی کو اپنے کندھوں پر لئے جارہے ہیں۔ نہیں وہ جانور نہیں۔ وہ انسان ہیں۔ وہ غلام ہیں۔ جانوروں کا کام کرنے والے۔ وہ راجہ کے جانور ہیں۔ وہ پردہ میں سے کیسے دیکھتا ہے؟۔ کیا وہ سُن سکتا ہے؟۔ ہاں، ہاں وہ پردہ میں سے دیکھ سکتا ہے۔ وہ پردہ میں سے سُن سکتا ہے۔ اپنے مشیروں کی زبان سے۔ اپنے وزیروں کی آنکھوں سے۔ اپنے درباریوں کی عقل سے۔ وہ راجہ ہے۔ یہ پولیس والے یہاں کیوں ہیں؟۔ یہ فوج یہاں کیوں ہے؟۔ سڑک کو صاف رکھنے کے لئے۔ راجہ کی حفاظت کرنے کے لئے۔ کیا راجہ کا کوئی دشمن ہے؟۔ نہیں۔ راجہ کا کوئی دشمن نہیں"۔ راجہ کے سب دشمن ہیں یہ کیسے؟ راجہ پر ماتما کا اوتار ہے۔ اس پر اللہ کا سایہ ہوتا ہے۔ خدا سے سب محبت کرتے ہیں۔ اس کے سایہ سے بھی سب محبت کرتے ہیں۔ راجہ کا کوئی دشمن نہیں۔ لیکن ایشور کے اس سایہ نے ایشوری صفات کو چھوڑ کر راکشسوں، شیطانوں اور مکاروں کو اپنا

مشیر بنایا۔ یہ سب فرعون کے وزیر کی مثال ہیں، جس کے عہد میں بدبو دار بارش ہی ہو سکتی تھی۔ جو صرف خرمن کو برباد کرا سکتا ہے۔ اب یہی مشیر وزیر، اس کے آس پاس حفاظت کے لئے ہیں۔ اُسے یقین دلائے ہوئے ہیں کہ عوام اُس کے حسنِ انتظام سے خوش ہیں۔ چند لوگ ہیں جو اُس کے دشمن ہیں اس لئے اُسکی حفاظت کی ضرورت ہے۔ ملک میں افلاس ہے۔ لوگوں میں فاقہ۔ عوام میں بیماریاں۔ جس ملک میں افلاس ہو اس ملک کو ایسے شاندار لباس موزوں نہیں۔ موزونیت انتظام عقل سے ہے۔ دولت سے نہیں۔ لیکن شیطان کے دور میں سب مکار رہتے ہیں۔ راجہ کے سب دشمن ہیں۔ اُس کے مشیر وزیر سب - اُنہوں نے ہمارا راجہ ہم سے چھین لیا۔ ہمارا راجہ ہم سے چھن گیا۔ ہم خود اُس سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ ہم خود اپنی کہانی اُسے نہیں سنا سکتے۔ ہم سب میں اونچ نیچ کا فرق پیدا کر دیا گیا ہے۔ وہ سب اُنہیں کے کہنے پر کرتا ہے۔ اُس کے سب دشمن ہیں "۔

(راجہ کی سواری آگے بڑھ رہی ہے۔ بچے اُس کے ساتھ ہیں۔ دوسرے موڑ پر ایک غریب ضعیف عورت، کوڑے کرکٹ کے انبار پر ہاتھ پھیلائے بیٹھی ہوئی ہے۔ کوئی اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ وہ سب کی صورتیں دیکھتی ہے۔ کسی نگاہ میں ہمدردی نہیں۔ کوئی اُسے بھیک بھی نہیں دیتا۔ ایک بچہ پوچھتا ہے)۔

یہ یہاں کیوں بیٹھی ہوئی ہے؟ " اپنا پیٹ پالنے کے لئے بھیک مانگ رہی ہے"۔ کیا ہمارا راجہ اُس کے پیٹ کے لئے روٹی بھی نہیں دے سکتا؟ - وہ اتنا مجبور کیوں ہے؟ - کیا دولت اُس کے ساتھ اُس کی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئی تھی؟ کیا ساری دولت اُس کی اپنی ہے؟ " نہیں"۔ اُسکے پاس دولت ہماری محنت کا نتیجہ ہے۔ وہ صرف امین ہے۔ تو وہ اس غریب عورت کو ہماری اس امانت میں سے کیوں کچھ نہیں دیتا؟ - مشیر کہتے ہیں کہ اس طرح بھیک دینے سے مدد کرنے سے لوگوں کی عادتیں بگڑتی ہیں۔ وہ محنت سے جی چرانے لگتے ہیں"۔ (عورت کوڑے کرکٹ میں کچھ تلاش کر رہی ہے) یہ کیا تلاش کر رہی ہے؟ - " شائد کوئی روٹی کا ٹکڑا مل جائے"۔ یہاں "روٹی کا ٹکڑا" کیسے۔ امیروں کے دسترخوان کے ٹکڑے، کسی غریب کے کام نہیں آ سکتے۔ وہ کسی کو دئیے نہیں جا سکتے۔ وہ اُنکے کتے کو بھی نہیں کھلائے جا سکتے۔ وہ صرف پھینک دئیے جاتے ہیں۔ یہ عورت انہیں تلاش کر رہی ہے۔ (عورت تلاش کرتی ہے۔ ہاتھ پھیلاتی ہے۔ سب کی طرف حسرت سے دیکھتی ہے۔ کوئی توجہ نہیں کرتا۔

درباریوں میں سے ایک کی نگاہ عورت پر پڑتی ہے۔ پھر پولیس کے سپاہی کی طرف۔ پولیس کا سپاہی اُس عورت سے اُٹھنے کے لئے کہتا ہے وہ نہیں اُٹھتی۔ وہ سختی سے کہتا ہے۔ وہ نہیں سنتی۔ وہ اُس کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتا ہے۔ وہ گھسٹ جاتی ہے۔ سب ہنس پڑتے ہیں۔ وہ اُس کو مارتا ہے اور ایک طرف ڈھکیل دیتا ہے۔ بچہ سوال کرتا ہے۔ یہ اس عورت کو کیوں مارتے ہیں؟۔ یہ سب اُس پر کیوں ہنستے ہیں؟۔ درباری کی نگاہوں کو اس میلی کچیلی عورت کو دیکھ کر تکلیف ہوتی ہے۔ خوش باشوں کے مجمع میں یہ گندگی کیسی وہ اس کو ہٹوا دینا چاہتا تھا۔ اُس نے پولیس کے جوان کی طرف اس لئے دیکھا کہ وہ اُس کو ہٹا دے۔ پولیس کا جوان اس حکم کی تعمیل کر رہا ہے۔ لوگ اُس عورت کی لاچاری پر ہنستے ہیں۔ وہ اُس سے ہمدردی نہیں کر سکتے۔ اُس عورت کے یہاں بیٹھنے سے کیا نقصان ہوتا ہے؟۔ وہ اُسے کیوں نہیں بیٹھے رہنے دیتے؟۔ وہ کسی کا کیا لے رہی ہے؟۔" وہ راستہ کی غلاظت ہے۔ اُس کا صاف ہونا ہی ضروری ہے۔ اُسے روٹی کیوں نہیں دیتے؟۔ اُسے کپڑے کیوں نہیں دیتے؟۔ اس غلاظت کو خود ہی صاف کیوں نہیں کر دیتے؟۔ بیکار کا معرف ہے۔ عورت پھر کوڑے کرکٹ پر آ بیٹھتی ہے۔ وہ اُس میں اپنے لئے آزوقہ تلاش کر رہی ہے۔ سواری آگے بڑھ رہی ہے۔ شہر سے باہر ایک کھیت میں کچھ عورتیں مختلف العمر پھٹے پرُانے کپڑے پہنے بیٹھی ہوئی کھلیان کو صاف کر رہی ہیں۔ وہ ہجوم کو دیکھتی ہیں۔ تھوڑی دیر دیکھتی رہتی ہیں پھر اپنے کام میں لگ جاتی ہیں۔ ہجوم اُن کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ بچہ سوال کرتا ہے۔ اُنھوں نے پہلے ہجوم کو دیکھا۔ پھر اپنے کام میں لگ گئیں کیوں؟۔ اُن کے مرد کہاں ہیں؟ "وہ سرکاری کام میں لگے ہوئے ہیں"۔ وہ جانتی ہیں کہ یہ کام نہ ہو سکا تو اُن کو روٹی بھی نہ مل سکے گی۔ وہ اپنی غربت کو دور کرنے کے لئے کام کر رہی ہیں۔ لیکن اُن کی محنت کے ثمر کا بڑا حصہ خزانے میں چلا جائیگا۔ وہ غریب رہ جائیں گی۔ وہ پھر غربت دور کرنے کے لئے کوششیں کرینگی۔ اور غریب رہیں گی، اور تقدیر کا چکر اسی طرح چکر لگاتا رہے گا"۔

سواری آگے بڑھ رہی ہے۔ کھنڈرات نظر آ رہے ہیں اور سنسان جنگل میں کھڑے ہوئے اپنی پُرانی تاریخ کا قصہ سنا رہے ہیں کہ ظلم کی حکومتوں کا عوام سے، غفلت کا، بیجا عیش کا، غیر انصافی کا، لالچ کا، فریب کا نتیجہ ہم سے پوچھو۔ آج ہم کو حکومتوں نے آثار قدیمہ میں شامل کر رکھا ہے۔ ہمارے اوپر صرف بھی بہت کچھ کیا جا رہا ہے، لیکن ہم میں کسی غریب کو سر لگانے شب بسر کرنے کی اجازت نہیں۔ ہم مردہ چیزوں پر حکومت صرف کر رہی ہے، لیکن ملک کے مردہ بظاہر زندہ غریب مفلس انسانوں کے پیٹ بھرنے کا سامان نہیں کرتی۔ ہمارے بنانے والوں کے ابتدائی مشاغل اس کے خلاف تھے۔ جب بدل دئے برباد ہو گئے۔ ہم ان کا قصہ سناتے ہیں۔ ہم سفید و سیاہ سے واقف ہیں۔ ہم تمہارا بھی نتیجہ جانتے ہیں۔ (سواری آگے بڑھ رہی ہے۔

بڑھتی چلی جارہی ہے۔ ہجوم کم ہوتا چلا جارہا ہے۔ راجہ اور اُس کے درباری رہ جاتے ہیں) یہ سب کہاں چلے گئے؟
سب اسی طرح چلے جائیں گے"۔ تماشے کی محبت اُن کو ساتھ لے آئی تھی۔ تماشہ ختم ہو چلا۔ وقت بہت گذر گیا۔
پیٹ پالنے کا خیال آگیا۔ چلے گئے۔ اگر اس بقیہ ہجوم میں اخلاص، محبت، رواداری، غریب کا درد ہوتا
تو وہ ہجوم اور آگے تک راجہ اور اُس کے ساتھیوں کا ساتھ دیتا۔ یہ ہمیں بتاتا ہے کہ راجہ صرف تنہا ہی جائیگا
اور درباری علٰحدہ علٰحدہ جائیں گے۔ اور پھر پوچھنے والا صرف راجہ ہی سے سوال کریگا اور چونکہ اُس کی آنکھیں
اُس کے کان، اُس کی زبان، اُس کے ساتھ نہ ہوں گی، وہ جواب نہ دے سکے گا۔ وہ حسرت سے اسی طرح
ہر طرف دیکھے گا جس طرح کوڑے کرکٹ پر بیٹھی ہوئی بوڑھی غریب عورت صورت سوال"۔

ہم سب بھی اس ہجوم کے ساتھ واپس آ گئے۔ اور اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے۔ آج تاجر بہت
خوش تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اب اُسے بہت کام ملیگا۔ وہ بہت کثیر نفع حاصل کر سکے گا۔ کسان خاموش
تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اب اُس کو خزانہ کے لئے اور روپیہ دینا پڑیگا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کام اور زیادہ
کرنا پڑیگا۔ شاعر مسرور تھا۔ وہ ایک نظم لکھنے میں مصروف ہو گیا۔ مصوّر سنجیدہ متفکر اُداس اور غمگین تھا۔
میں دفتر چلا گیا۔ تاجر درباریوں کی طرف۔ کاشتکار کھلیان کی طرف اور مصوّر —————— چوبیس گھنٹے
گزر گئے، اڑتالیس گذر گئے، بہتر گذر گئے۔ مصوّر تصویر بنا رہا ہے۔ اُس نے کچھ کھایا بھی نہیں ہے۔ ہم
اُس کے انہماک میں دخل بھی نہیں دے رہے ہیں۔ وہ اپنے کام میں مشغول ہے۔ بے نیاز۔ اُس نے ایک تصویر
بنائی۔ کیسی؟ ہم نے نہیں دیکھا۔ وہ اُس تصویر کو لے کر چلا گیا۔ آرٹ کی نمائش ہو رہی ہے۔ مصوّر کا پتہ
نہیں۔ ہم سب نمائش دیکھنے گئے۔ ایک تصویر دیکھی جس میں راجہ کی سواری۔ عوام کا ہجوم۔ بچے۔ کوڑے
کرکٹ پر ہاتھ پھیلائے ہوئے ایک ضعیف عورت۔ کھلیان میں عورتیں۔ کھنڈرات۔ سنسان جنگل۔ اور
تقدیر کا چکّر بنا تھا۔ اس تصویر پر پہلا انعام ملا۔ وہ مصوّر کا شاہکار قرار دی گئی تھی۔ مصوّر سجانی وہ ہمارے
ساتھ میں تھا۔ اس تصویر کے نیچے "حسین" لکھا تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ رنگوں کی تعریف تھی۔ اُس غریب کوڑے کرکٹ
پر بیٹھنے والی عورت کے تقدیر کے چکّر کی یا پھر مصوّر کی؟

ہم اپنے مکان واپس آ گئے۔ سجانی موجود تھا۔ ایک کرسی پر سامنے سر کو جھکائے ایک ہاتھ میں بُرش
سامنے ایک کاغذ کا تختہ۔ ایک طرف رنگوں کا بکس۔ دوسری طرف ایک آئینہ۔ اُسے آواز دی۔ وہ
غافل تھا۔ اُسے ہلایا۔ وہ مردہ تھا۔ زندگی کا شاہکار بنا کر۔ مردہ۔ بقائے دوام حاصل کرنے کے بعد +

لڈن میاں کے قلم سے

"ماموں چھن نے ملاقات کی"

"الف کے نام لٹھ جانتے نہیں بحث کرنے آجاتے ہیں۔ پوچھو میاں آپ کی تعلیم کہاں تک ہے تو بغلیں جھانکنے لگتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ آجکل کے نوجوانوں میں بحث کا مادہ اتنا کیوں بڑھ گیا ہے۔"

ماموں چھن کو نہ معلوم کیوں غصہ آرہا ہے میں تو کچھ بتلا نہیں سکتا۔ شاید کسی کی کوئی بات ناگوار گذری ہوگی۔ میری طرح آپ بھی اُن کی باتوں کو سنتے رہئیے، اگر آپ اُن کی باتوں کے درمیان بولیں گے تو اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ اس طرح آپ کے پیچھے پڑ جائیں گے کہ پیچھا چھڑانا مشکل ہوجائیگا۔ وہ تو اُن کا نوکر کلوا ہی اُن سے خوب نبٹنا سلجھتا رہتا ہے۔

"آئے بڑے بحث کرنے والے۔ وہ تو خیر ہوئی کہ چل دئیے، ورنہ ایسی خبر لیتا کہ یاد ہی رکھتے۔ کلوا، او کلوا۔ کہاں مرگیا۔ آتا نہیں۔ بولتا نہیں۔"

کلوا۔ جی سرکار.......

ماموں چھن۔ کلوا۔ اب اگر کوئی آئے تو کہدینا وہ گھر پر نہیں ہیں یعنی "میں"۔ سمجھا.... کہنا کہ وہ سو رہے ہیں... اچھا کہدیجیو کہ کام میں مصروف ہیں۔ اور اگر کوئی اڑیل ہو تو کہنا کہ اُن کا انتقال ہوگیا۔ اور اگر نہ مانیں تو کہنا آپ رخصت ہوجائیے وہ ہیں گھر پر ہی کچھ کام بھی نہیں کر رہے ہیں۔ مکھیاں مار رہے ہیں لیکن وہ آپ سے ملنا نہیں چاہتے۔ بس آپ جائیے۔ بھاگ جائیے اور فوراً چلے جائیے...... سمجھ گیا کہ نہیں؟

کلوا۔ ہاں تو سرکار یہ سب باتیں کہدوں!

ماموں چھن... تجھے سمجھا تو دیا سب باتیں الف سے ے تک کہدینا۔

کلوا۔... مگر سرکار.... آپ کے پاس تو پڑھے لکھے اور بڑے بڑے آدمی آتے ہیں۔

ماموں چھن۔ ہنھ۔ میں کیا کروں۔ کیا میں پڑھا لکھا نہیں ہوں۔ کیا میں بڑا نہیں۔ تجھے کیا.... زبان بند کر ورنہ کاٹ ڈالوں گا۔ مجھے بہت غصہ آرہا ہے۔

کلوا۔ سرکار میں کچھ نہیں کہہ رہا۔ میں تو فقط یہ کہہ رہا ہوں کہ ان لوگوں سے اتنے بیزار نہ ہوں۔

ماموں چھن۔ ہائے۔ ہائے۔ اُف..... چپ ہوجا۔ باتیں نہ بنا۔ ابھی تک تو وہ گدھے میرا دماغ کھارہے تھے

اور اب تو میرا بھیجہ پلپلا کئے دیتا ہے۔ آخر تجھے بحث کرنے اور سمجھانے کی کیا ضرورت..... اب تو باہر بیٹھ کوئی میرے پاس نہ آنے پائے۔

کلو دروازہ پر بیٹھا ہوا ہے۔ کوئی صاحب یعنی ایک صاحب سفید پوش صورت سے بھلے مانس آئے ہیں۔

ملاقاتی۔۔ تمہارے بابو صاحب ہیں۔۔۔

" جی! ہاں! ..... جی! نہیں ہیں "

" ہیں بھی ..... اور نہیں بھی ہیں۔۔ کیا مطلب "

" جی..... گھر پر نہیں ہیں..... و... و... و... سو رہے ہیں... ن۔ ن۔ ن..... نہ..... جی وہ کام میں مصروف ہیں

کیا!! وہ گھر پر نہیں ہیں... سو رہے ہیں۔ کام میں مصروف ہیں۔ کیا خوب... کیا معمّہ ہے۔ اندر جا اور بابو صاحب سے کہہ کہ آپ سے ملنے کوئی صاحب آئے ہیں۔"

کلوا..... میں کیا کہوں صاحب..... اُنہوں نے افیون کھالی ہے غالباً خودکشی کا ارادہ ہے۔

ملاقاتی..... ایں!..... کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے۔ اندر جا۔ میرا کہہ۔ میں اُن سے ملنا چاہتا ہوں۔ بہت دن سے اُن سے ملاقات نہیں ہوئی ہے۔ جب میں پہلے آیا تھا تو اُن کی طبیعت خراب تھی۔

" جناب اُن کی طبیعت اب بھی خراب ہے..... آپ اُن سے نہیں مل سکتے..... آپ کو گھر میں جانے کی ممانعت ہے۔ اُن کا انتقال ہو گیا ہے۔"

" کیا زیادہ پی لی ہے یا تو سنک گیا ہے۔"

" نہیں تو..... میں تو نہیں سنکا۔ بابو جی سنک گئے ہیں جب ہی تو وہ انتقال کر رہے ہیں۔ "

" تو میں جاتا ہوں اور ڈاکٹر کو لاتا ہوں۔"

" ذرا ٹھہریئے صاحب..... اُنہوں نے خودکشی نہیں کی ہے بلکہ کوئی بھوت اُن کے سر پر چڑھ بیٹھا ہے۔ "

" تو پھر میں ڈاکٹر صاحب اور مولوی صاحب دونوں کو ابھی ابھی لاتا ہوں۔

" ارر صاحب ایسا تو نہ کیجئے وہ تو خود ہی گانے لگے تھے ناچنے لگے تھے اور خود سے باتیں کرنے لگے تھے اور پھر مجھے ڈانٹنے لگے تھے....."

یہ لیجئے یہ ملاقاتی صاحب بھی عجب آدمی ہیں کلوا کی پوری بات سنے بغیر چل دیئے اور کلوا کہتا ہی گیا۔ " بابو جی صاحب بابو جی صاحب۔ ذرا ٹھہریئے۔ ذرا سنئے تو.....

یہ ملاقاتی صاحب پہلے ڈاکٹر صاحب کے گھر پہونچے ان کو اپنے ساتھ لیا - ڈاکٹر صاحب نے بہت سی دوائیں انجکشن وغیرہ اپنے ساتھ رکھ لئے - پھر مولوی صاحب کے گھر گئے اور انھیں بھی اپنے ساتھ لیا۔ راستہ میں دوچار دوستوں کو لیا اور باتیں کرتے ہوئے یہ لوگ روانہ ہوئے -

کلو اندر میں گیا ملاقاتی صاحب کے آنے کا سارا ماجرا اپنے بابو صاحب سے بیان کیا اور اس کے بعد صلاح دی کہ آپ اوڑھ لپیٹ کر لیٹ جائیے جب وہ صاحب پھر آئینگے تو میں کہدونگا کہ انھیں بخار چڑھا ہے اگر نہیں مانے تو آنکھیں لال پیلی بنا لوں گا - بابو جی نے اپنی اور کلو اکی بات رکھنے کے لئے اس کے کہنے پر عمل کیا کلوا باہر گیا اور بیٹھ گیا۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہے کہ وہی حضرت معہ ڈاکٹر صاحب و مولوی صاحب و چند دیگر ہمراہیوں کے آرہے ہیں - یہ ڈرا اور جلدی سے گھر میں جاکر اپنے بابو صاحب سے کہدیا - بابو جی نے سب سننے کے بعد اور اچھی طرح اوڑھ لپیٹ لیا - چہرہ کچھ کچھ سرخ ہوگیا اور جسم بھی گرم ہو گیا -

وہ ملاقاتی صاحب گھر پر آگئے اور کلوا اُن کو معہ اُن کے ہمراہیوں کے گھر میں لے گیا -

ملاقاتی صاحب ..... ڈاکٹر صاحب ذرا دیکھئے تو افیوں کا اثر زیادہ تو نہیں ہو گیا ؟

ڈاکٹر صاحب نے بیماروں کے دیکھنے کا آلہ بابو صاحب کے سینہ پر رکھا - نبض دیکھی - دیکھتے ہی گھبرائے - کہنے لگے "یہ تو قریب الختم ہیں - ان کو جلدی جلدی ٹہلاؤ" بابو صاحب نے جو یہ سنا تو اپنا جسم سخت کرلیا اور اکڑ گئے - بڑی دقت سے سب آدمیوں نے انھیں اٹھایا اور ٹہلانے لگے - ڈاکٹر صاحب نے غالباً بہت سی پٹاس نکالی پانی میں ملائی تاکہ وہ بابو صاحب کے پیٹ میں پہونچائی جائے - کلوا نے جو یہ ماجرا دیکھا تو وہ گھبرا گیا - فوراً بولا "حضور ڈاکٹر صاحب! بابو جی نے خودکشی نہیں کی ہے - وہ سو رہے ہیں - گھر پر نہیں ہیں .....

ڈاکٹر صاحب کلوا کی بات سن کر ہنس پڑے ..... کلوا بولا "حضور ڈاکٹر صاحب میری بات کو سچ جانیں - بابو جی نے اپنے سر بھوت بلالیا ہے" ڈاکٹر صاحب نے ایک صاحب سے کہا کہ یہ نوکر بھی بابو صاحب جیسا ہی معلوم ہوتا ہے

بھوت کا جو سنا تو اب مولوی صاحب کے چہرے پر پانی آگیا - اکڑ کر ذرا آگے بڑھے - زور زور سے اور جلدی جلدی کچھ پڑھنا شروع کیا ——— دیکھنا ..... دیکھنا ... وہ آیا ... آگیا ... ابھی ابھی اُترتا ہے ...
میں تو سالہا سال سے سنتا چلا آیا ہوں کہ اس گھر میں بھوت ہیں - آج آخر ان کے سر آ ہی گیا ... ابھی اُتارتا ہوں یہ کہکر بابو صاحب کے سر کے بال بڑی زور سے پکڑے ....

بابو صاحب کی عجب حالت ہے ایک طرف تو اُن کو ٹہلایا جا رہا ہے اور دوسری طرف مولوی صاحب نے اُن کے بال بڑی مضبوطی سے پکڑ رکھے ہیں..... بابو صاحب کو سچ مچ پاگل بنا دیا۔ اُن کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ آنکھیں باہر نکلنے لگیں۔ وہ چیخنے چلّانے لگے لیکن اُن کی سنتا کون۔ ڈاکٹر صاحب افیون کا نشہ اُتار رہے تھے تو مولوی صاحب اُن کے سر کا بھوت بھگا رہے تھے..... بیچارے بہت چیخے چلّائے۔ گالیاں دیں۔ قلبی بددعائیں یا دنہیں دیں۔ (جنت دوزخ عذاب و ثواب۔ فرشتے۔ پیغمبر۔ اللہ میاں سب کے واسطے دئیے لیکن ایک نہ چلی۔ آخر انہوں نے کہا۔ حضرات آپ یہ تو بتلائیے کہ آپ چاہتے کیا ہیں کیوں مجھے اس قدر پریشان کر رہے ہیں.....

مولوی صاحب..... ابے ابھی بتلائے دیتا ہوں کیا چاہتا ہوں..... لینا۔ اس کی خبر لینا.....

جب ماموں چھٹن نے دیکھا کہ نہ مولوی صاحب مانتے ہیں اور نہ ڈاکٹر صاحب تو انھوں نے مارنے کی کوشش کی۔ مولوی صاحب نے فوراً حکم دیا..... دو فلیتے جلائے جائیں ایک اُن کے سرہانے دوسرا پائنتیں اور انکو لٹا دیا جائے۔ بابو صاحب لٹا دیئے گئے۔ ماموں کہنے لگے:۔

"اچھا مولوی صاحب آپ کو آپ کے کرتوتوں کا مزہ پھر کبھی چکھاؤں" اور ڈاکٹر صاحب آپ بھی ہوشیار رہئے گا"
ڈاکٹر صاحب سمجھے کہ سچ مچ بھوت آگیا ہے وہ کچھ دوائیں دیکر جانے لگے کلوا بولا:۔

"سرکار تھوڑی دیر اور ٹھہر جائیے جب بھوت اُتر جائیگا تو ان کا انتقال ہو جائیگا"

ڈاکٹر صاحب کچھ سوچ کر ٹھہر گئے۔ مولوی صاحب نے دو چار فلیتے اور جلائے۔ دھونی دی۔ کلوا بولا "بس مولوی صاحب اب بس کیجئے..... بابو جی ہیں..... یہیں ہیں۔ گھر پر ہیں لیکن وہ آپ صاحبان سے ملنا نہیں چاہتے..... آپ سب تشریف لیجائیے" لیکن ان حضرات میں سے ٹلنے والا کون تھا۔ جب دیکھا کہ کوئی نہیں ٹلتا ہے تو وہ ایک ڈنڈا لیکر آیا اور.....

"آپ سب فوراً یہاں سے نکل جائیے۔ یہ میرے آقا ہیں۔ میں ان کا غلام ہوں آپ ان کو زیادہ پریشان نہ کریں ورنہ میں آپ کی اچھی طرح مرمت کر دونگا۔ سارے وظیفے، گنڈے، تعویذ بھول جائیں گے۔ مولوی جی جائیے ڈاکٹر صاحب آپ بھی چلے جائیے ورنہ آپ کو ڈاکٹری کرنا بھلا دونگا۔ دیگر ہمراہیوں کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔

"آپ کو یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی۔ جائیے۔ آپ سب لوگ فوراً چلے جائیے میں حکم دیتا ہوں نہیں تو گھروں تک پہونچنا مشکل کر دونگا....."

مولوی صاحب سمجھے کہ ماموں چھٹن کے سر جو بھوت آیا ہے اُس بھوت کا غلام کلوا پر آگیا ہے مولوی صاحب نے کہا:۔

اتیری بھی مرمت کرتا ہوں - جب تیرے آقا کی مرمت کر ڈالی تو تو کیا چیز ہے -"

"جا جا مولوی - تجھ جیسے مولوی بہت سے دیکھے ہیں کیوں تیری شامت آئی ہے -"

مولوی صاحب نے وہ ڈنڈا کلوا کے ہاتھ سے چھین لیا اور کچھ پڑھنا شروع کیا - کلوا نے خیال کیا کہیں سچ مچ میرے سر بھوت نہ آجائے تو وہ بھاگ گیا - ماموں مچھن چپ چاپ پڑے ہوئے تھے - وہ سوتے سے بن گئے - لوگ گھروں کو واپس ہونا شروع ہو گئے - کلوا جو بھاگا تو سیدھا کلاری پہونچا - شراب کا بہت زیادہ عادی تھا - جاتے ہی پی اور خوب پی - اور پھر گھر واپس آیا - گھر پر ماموں مچھن کو انتظار کرتے ہوئے پایا - کلوا آتے ہی لیٹ گیا - تھوڑی دیر تو چپ چاپ لیٹا رہا پھر کہنے لگا -

"بابو جی آپ کا بھوت اُتر گیا ؟ ..... ہٹنا ..... ہٹنا ..... ہٹ ..... بابو جی ..... ہا ..... ہا ..... ہاں ..... وہ ..... وہ ..... وہ ..... وہ گری ..... بھاگو ..... بچنا ..... بچنا ..... بابو جی ..... وہ گری "

ماموں کہنے لگے "ارے کیا گری ؟"

" دیکھئے نا وہ گری آسمان سے ..... آپ کو نہیں نظر آتی - معلوم ہوتا ہے ابھی آپ کا بھوت نہیں اُترا "

ماموں مچھن نے جواب دیا "معلوم ہوتا ہے وہ بھوت اب تجھ پر آگیا ہے" اور قہر درویش برجان درویش کے مصداق چپ چاپ پڑے رہے -

" دیکھنا ..... دیکھنا ..... آہا ہا ..... وہ نکالا ..... وہ نکالا ..... او ہو ہو ہو ..... آج اس ندی میں مچھلی نہ معلوم کہاں سے آگئی ..... بابو جی ..... ارے ماموں جان ..... بابو جی ..... دوڑنا ..... ذرا جلدی دینا ..... ابھی پکڑتا ہوں ..... "

ماموں مچھن سمجھ گئے تھے کہ آج کلوا نے زیادہ پی لی ہے اس لئے وہ صبر کئے رہے -

"ہیں - ایں ..... یہ دو دھائی ہوئی ہے ..... بیوقوف کہتے ہیں سولہ کی دونی نہیں ہوتی ..... بابو جی آپ سچ کہتے ہیں یہ لوگ عقل کے ٹٹو ہیں - اچھا ہوا آپ اُن سے نہیں ملے "

اب تو ماموں مچھن کے صبر کا پیمانہ لبریز ہی ہو گیا "چپ رہ ورنہ تیرا بھوت اُتارتا ہوں "

کلوا - آپ کیا بھوت اُتار سکتے ہیں ..... ابھی حکم دیتا ہوں ..... اہی ہی ہی ..... ایں ..... بابو جی آپ سوتے میں باتیں کیسے کرتے ہیں ..... اہی ہی ہی ..... بابو جی ..... بابو جی ..... چھپئے ..... وہ پھر آرہے ہیں ..... جا جا بابو جی نہیں ہیں ..... سو رہے ہیں ..... کام میں مصروف ہیں ..... اچھا جائیے اُن کا انتقال ہو گیا ..... ارے تو جاتا ہے یا نہیں ..... وہ ہیں ..... یہیں ہیں ..... گھر پر ہیں ..... لیکن وہ تجھ سے ملنا نہیں چاہتے ..... ارے ذرا

سنئے تو اُن کے سر بھوت آگیا ہے ..... خود کشی کا ارادہ ہے ..... ڈاکٹر صاحب کو نہ لائیے گا ..... نہیں میں تو نہیں سنکا۔ بابو جی سنک گئے ہیں ..... کیوں بابو جی میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا ؟ ۔

اب بابو جی یعنی ماموں مچھن سے نہ رہا گیا ۔ ڈنڈا سنبھالا ۔ کلوا دیکھ کر کہنے لگا ..... ہیں ..... تم کون ہو ۔ میرے کاموں میں تم کو مداخلت کا کیا حق حاصل ہے ..... ہٹ جاؤ میرے سامنے سے ورنہ ٹپ دادونگا ..... بابو جی بولے ..... میں زندہ بھوت ہوں اور تیرا بھوت اُتارنے آیا ہوں ۔ یہ کہکر پیٹنا شروع کیا ۔ کلوا کا جونشہ اُترا تو کہنے لگا۔ "بابو جی کیا آپ کے سر سچ مچ بھوت آگیا "

ماموں مچھن ۔ نمک حرام ۔ کمبخت ، حرام زادہ حلال زادہ کا قصہ کر دیا ۔ ناک کان کی بدلی ہے .. نکل جا میرے یہاں سے ۔ مجھے ایسے عقلمند نوکر کی ضرورت نہیں ..... مکار ..... مطلبی ۔ جان کے پیچھے پڑ گیا ..... کیا کیا جتن کئے ۔ میرے سر بھوت بلوایا ..... اور مجھے پیٹ ..... نکل جا دور ہو جا میری صورت کے سامنے سے ۔

کلوا ۔ حضور اس میں میری کیا خطا ہے حضور نے جیسا کہا تھا میں نے ویسا ہی کیا ۔ میں تو حکم بجالایا ۔ میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ حضور پڑھے لکھے آدمیوں سے اتنے بیزار نہ ہوں ۔ میں خود بھی رہنا نہیں چاہتا اور اسی لئے یہ سب .....

ماموں مچھن ۔ خاموش رہ ..... اب آگے کچھ نہ کہنا ..... نکل جا ..... مرجا ..... ابھی نکل جا .....

دوسرے دن اخبار پر نظر ڈالی تو بڑی موٹی موٹی سرخی سے لکھا تھا ۔

"ماموں مچھن کے سر بھوت ۔ ڈاکٹر صاحب اور مولوی صاحب کا علاج ۔ حالت روبہ صحت ہے " . . .

ماموں مچھن نے جو یہ دیکھا تو اُنھوں نے بھی ایک مضمون لکھا ۔ اخبار میں خبر چھپوائی ۔ خبر بڑی موٹی موٹی سرخیوں سے لکھی گئی ۔

" میرے سر سے بھوت اُتر گیا ۔ میری صحت یابی ۔ ڈاکٹر صاحب اور مولوی صاحب کو اُن کے کامیاب علاج پر مبارکباد ۔ نوکر کے سر بھوت آیا ، وہ میں نے اُتارا ۔ چند دن کے بعد لوگوں کو اصل واقعہ کی خبر ہوئی +

(بقیہ صفحہ ۴۹ کا) آخر میں جس پانچویں مرحلہ کی پیشینگوئی کی گئی ہے تمام قرائن بتا رہے ہیں کہ تاریخ تیزی کے ساتھ اس طرف بڑھ رہی ہے انسانی ساخت کے سارے مسلک آزمائے جا چکے ہیں اور بری طرح ناکام ہو چکے ہیں انسان کے لئے اب کوئی چارہ نہیں کہ چاروں طرف سے تھک ہار کر اسلام کی طرف رجوع کرے ۔ اس لئے ضرورت ہے کہ مسلمانوں کے وہ تمام ارباب فکر و بصیرت جنھیں علوم اسلامی پر کافی عبور ہے اس طرف متوجہ ہوں ۔ اور بنیادی طور پر ان اُمور کیا تعد میں لیں جن سے امت مسلمہ میں اصلی اسلامی روح پیدا ہو جائے اور وہ صحیح معنوں میں مسلمان بن جائیں +

اختر انصاری اکبر آبادی

انیسویں صدی میں اردو غزل گوئی

ہر ادب اپنے ماحول اور سوسائٹی سے بہت متاثر ہوتا ہے۔ خوشی کے وقت واہ اور رنج کے وقت آہ نکلنا فطرت کے عین مطابق ہے چنانچہ اردو غزل گوئی بھی اسی قانون کی پیروی کرتی ہے۔ انیسویں صدی ہندوستان کی تاریخ میں ایک نئے باب کے افتتاح کا درجہ رکھتی ہے۔ پھر اردو غزل گوئی کیوں اس سے متاثر نہ ہوتی؟ ۔ اس عہد کی غزل گوئی کا مطالعہ کرنے سے قبل اس دور کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی حالات کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ اس کے بعد یہ فیصلہ بآسانی ہو سکے گا کہ وہ حالات کہاں تک اردو غزل گوئی کے لئے موافق ثابت ہوئے۔

تاریخی شواہد کے علاوہ رقعات غالب، مسدس حالی، خطبات سرسید، دواوین شعرا اس زمانہ کی صحیح عکاسی پیش کرتے ہیں۔ میر صاحب فرماتے ہیں ؎

ہنگامہ گرم کن جو دلِ ناصبور تھا   پیدا ہر ایک نالہ سے شور نشور تھا

"محمد شاہی عہد کے بوڑھے" کا یہ شعر دلی کی حالت کا صاف آئینہ ہے۔ سیاسی کشمکش اور اقتصادی بے چینی نے دلوں میں ایک ہیجان برپا کر رکھا تھا۔ سکون و اطمینان کی جگہ اضطراب و بے چینی کارفرما تھی۔ آفتوں کا ایک بے پایاں سمندر بہہ رہا تھا جب انسان کسی سخت تکلیف میں مبتلا ہوتا ہے تو وہ بلبلا بلبلا کر روتا ہے "نالوں سے آسمان سر پر اُٹھا لینا" ان ہی معنوں میں مستعمل ہے۔ چنانچہ معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کی مصیبت حد کو پہنچ چکی تھی۔

شاعر قوم کا سچا مظہر ہوتا ہے۔ اس کی آواز عوام کی آواز ہوتی ہے۔ اس کے دل کا درد عوام کے دل کا درد ہوتا ہے۔ اس کی اندرونی کسک قوم کی آپ بیتی کا عکس ہوتی ہے۔ اور اگر یہ بات نہیں ہے تو وہ اس مغنی سے زیادہ نہیں جو اپنے ذاتی مفاد کی بنا پر وقتی راگنی الاپتا ہے چونکہ "شاعری جزویست از پیغمبری" اس لئے اس کا مرتبہ افضل ہے۔ آئیے اب تواریخی شواہد ہاتھ میں لے کر اس زمانہ کی حالت کا جائزہ لیں۔

سلطنت مغلیہ دم توڑ رہی تھی۔ اس کی شان و شوکت خاک میں مل رہی تھی۔ دہلی کے در و دیوار اس کی مٹی ہوئی دولت کی مرثیہ خوانی کر رہے تھے۔ دہلی کی عسرت پہ آنسو بہا رہی تھی۔ مایوسی و حرماں نصیبی کی حکومت تھی۔ " حکومت جس کو بلمد نے لال قلعہ سے تا شام تک تسلیم کیا ——— جس کو اکبر نے اپنی محبت آمیز پالیسی سے سنبھالا

مضبوط کیا ــــ جس کو "شاہجہاں" کی دانائی نے قائم رکھا ــــ جس کو "جہانگیر" کی عدالت نے چار چاند لگائے ــــ اور "اورنگ زیب" کی سیاست نے اس کو ترقی کے بلند ترین مرتبہ پر پہونچایا وہ تیرِ حوادث کا نشانہ تھی ــــ نادر شاہ کا حملہ احمد شاہ ابدالی کا قہر قیامت سے کم نہ تھا ــــ کہ زمانے نے نیا ورق پلٹا ــــ مغربی سنگینیں چمکیں ــــ اور آن کی آن میں کایا پلٹ ہو گئی ــــ جو سفیر مہمان بن کر آئے تھے میزبان بن بیٹھے ــــ دہلی کی رونق جاتی رہی ــ کالوں کا غول جاٹوں کی یورش، مرہٹوں کی سربلندی غرض کیا کیا نہ ہوا۔ جب پایۂ تخت کا یہ عالم تھا تو ــــ دور دراز ہندوستان میں ایک طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ ڈاکٹر ایشور پرشاد لکھتے ہیں۔

روہیلکھنڈ میں روہیلوں نے اپنی سلطنت قائم کر لی تھی ۔ چورا مل جاٹ کے لڑکوں نے بھی بغاوت کی مرہٹوں نے دکن میں اپنی دھاک بٹھلانے کے بعد شمالی ہند کا رُخ کیا ــــ آہستہ آہستہ گجرات، مالوہ، بندیلکھنڈ اور بنگال پہ قابض ہو گئے ۔ اور باجی راؤ دوم کی سرکردگی میں انہوں نے مغلوں کی حکومت پر اپنا رعب قائم کر لیا ــــ"

اس عہد میں ایک حکومت کا استقام اور دوسری کا زوال تھا۔ ایک حکومت اپنی آخری سانس لے رہی تھی تو دوسری شباب کے مزے۔ ایک کا گھر پھک رہا تھا تو دوسرے ہاتھ تاپنے میں مشغول تھے۔ اسی دوران میں ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ قیامت صغریٰ سے کم نہ تھا انقلاب، جنون اور دیوانگی کا ایک طوفان ہوتا ہے۔ وحشیانہ ہنگاموں کا ایک سیلاب ہوتا ہے جو آن کی آن میں ہر اُس چیز کو بہا لیجاتا ہے جو اس راہ میں حائل ہوتی ہے انقلاب ان حیوانی قوتوں کی کار فرمائی کا نام ہے جو کسی قانون یا ضبط و نظم سے مانوس ہی نہیں ہوتیں۔

نئی حکومت قائم ہوئی۔ نئی حکومت کے ساتھ نئی طرزِ معاشرت کی داغ بیل ڈالنے کے لئے ایسے ہادیانِ طریقت کی ضرورت تھی جن کی عقلیں نئی روشنی سے منور ہوں جو اس بادیہ ضلالت میں شمعِ ہدایت کا کام کر سکیں۔ یہ ہادی و رہبر تمدن کی رفتار تیز اور سریع کر دیتے ہیں، اور ہر شخص میں ایک نفسی تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے جس کا سبب تین باتوں میں سے ایک ضرور ہوتا ہے۔

(۱) ضروریات زندگی (۲) آب و ہوا اور جغرافی حالات کا اثر (۳) علوم و فنون، صنعت و حرفت، مذہبی عقائد

زمانہ اپنی رفتار کے مطابق شاعر اور ادیب پیدا کرتا ہے۔ چنانچہ ایسے وقت میں ظاہر ہے کہ دلّی نے کن موتیوں کی حفاظت کی ہوگی، شعرا نے کیا کیا ہوگا۔ دلّی کو چھوڑ کر اب لکھنؤ کی طرف قدم بڑھایا جائے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ نے ہندوستان کے چپے چپے میں بے چینی کی ایک لہر دوڑا دی تھی۔ محمد شاہ کے دور میں مرکز اردو دہلی تھا جس کی حالت آپ کے سامنے پیش کی جا چکی ہے۔ جب دہلی اُجڑی تو نوابین اودھ کی ضیافتیں شروع ہوئیں۔ لکھنؤ آباد ہوا ہر فن کے صاحبِ کمال وہاں جمع ہوئے۔ لکھنؤ رشکِ گلزار ہو گیا علم و حکمت میں خطۂ یونان تھا۔ شعر و سخن میں شیراز و

اختر انصاری اکبر آبادی

انیسویں صدی میں اردو غزل گوئی

ہر ادب اپنے ماحول اور سوسائٹی سے بہت متاثر ہوتا ہے۔ خوشی کے وقت واہ اور رنج کے وقت آہ نکلنا فطرت کے عین مطابق ہے چنانچہ اردو غزل گوئی بھی اسی قانون کی پیروی کرتی ہے۔ انیسویں صدی ہندوستان کی تاریخ میں ایک نئے باب کے افتتاح کا درجہ رکھتی ہے۔ پھر اردو غزل گوئی کیوں اس سے متأثر نہ ہوتی؟۔ اس عہد کی غزل گوئی کا مطالعہ کرنے سے قبل اس دور کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی حالات کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ اس کے بعد یہ فیصلہ بآسانی ہو سکے گا کہ وہ حالات کہاں تک اردو غزل گوئی کے لئے موافق ثابت ہوئے۔

تاریخی شواہد کے علاوہ رقعات غالب، مسدس حالی، خطبات سرسید، دواوین شعرا اس زمانہ کی صحیح عکاسی پیش کرتے ہیں۔ میر صاحب فرماتے ہیں ؎

ہنگامہ گرم کن جو دلِ ناصبور تھا پیدا ہر ایک نالہ سے شورِ نشور تھا

"محمد شاہی عہد کے بوڑھے" کا یہ شعر دہلی کی حالت کا صاف آئینہ ہے۔ سیاسی کشمکش اور اقتصادی بےچینی نے دلوں میں ایک ہیجان برپا کر رکھا تھا۔ سکون و اطمینان کی جگہ اضطراب و بےچینی کارفرما تھی۔ آفتوں کا ایک بے پایاں سمندر بہہ رہا تھا۔ جب انسان کسی سخت تکلیف میں مبتلا ہوتا ہے تو وہ بلبلا بلبلا کر روتا ہے۔ "نالوں سے آسمان سر پر اٹھا لینا" ان ہی معنوں میں مستعمل ہے۔ چنانچہ معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کی مصیبت حد کو پہنچ چکی تھی۔

شاعر قوم کا سچا مظہر ہوتا ہے۔ اس کی آواز عوام کی آواز ہوتی ہے۔ اس کے دل کا درد عوام کے دل کا درد ہوتا ہے۔ اس کی اندرونی کسک قوم کی آپ بیتی کا عکس ہوتی ہے۔ اور اگر یہ بات نہیں ہے تو وہ اس مغنی سے زیادہ نہیں جو اپنے ذاتی مفاد کی بنا پر وقتی راگنی الاپتا ہے چونکہ "شاعری جزویست از پیغمبری" اس لئے اس کا مرتبہ افضل ہے۔ آئیے اب تاریخی شواہد ہاتھ میں لے کر اس زمانہ کی حالت کا جائزہ لیں۔

سلطنتِ مغلیہ دم توڑ رہی تھی، اس کی شان و شوکت خاک میں مل رہی تھی۔ دہلی کے در و دیوار اس کی مٹی ہوئی دولت کی مرثیہ خوانی کر رہے تھے۔ دہلی کی جبروت چار آنسو بہا رہی تھی۔ مایوسی و حرماں نصیبی کی حکومت تھی۔ وہ حکومت جس کو بابر نے اپنی خون تیغ آشام سے قائم کیا ـــــــ جس کو اکبر نے اپنی محبت آمیز پالیسی سے

مضبوط کیا ———— جس کو "شاہجہاں" کی دانائی نے قائم رکھا ———— جس کو "جہانگیر" کی عدالت نے چار چاند لگائے ———— اور "اورنگ زیب" کی سیاست نے اس کو ترقی کے بلند ترین مرتبہ پر پہونچایا وہ تیرِ حوادث کا نشانہ تھی ———— نادر شاہ کا حملہ احمد شاہ ابدالی کا قہر قیامت سے کم نہ تھا ———— کہ زمانے نے نیا ورق پلٹا ———— مغربی سنگینیں چمکیں ———— اور آن کی آن میں کایا پلٹ ہوگئی ———— جو سفیر مہمان بن کر آئے تھے میزبان بن بیٹھے ———— دہلی کی رونق جاتی رہی - کالوں کا غول جاٹوں کی یورش، مرہٹوں کی سربلندی غرض کیا کیا نہ ہوا - جب پایۂ تخت کا یہ عالم تھا تو ———— دور دراز ہندوستان میں ایک طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا - ڈاکٹر ایشور پرشاد لکھتے ہیں -

روہیلکھنڈ میں میلوں نے اپنی سلطنت قائم کرلی تھی - چورا مل جاٹ کے لڑکوں نے بھی بغاوت کی مرہٹوں نے دکن میں اپنی دھاک بٹھلانے کے بعد شمالی ہند کا رُخ کیا ——— آہستہ آہستہ گجرات، مالوہ، بندیلکھنڈ اور بنگال پر قابض ہوگئے - اور باجی راؤ دوم کی سرکردگی میں انہوں نے مغلوں کی حکومت پر اپنا رعب قائم کرلیا ———"

اس عہد میں ایک حکومت کا استقامِ اور دوسری کا زوال تھا - ایک حکومت اپنی آخری سانس لے رہی تھی تو دوسری شباب کے مزے - ایک کا گھر ٹھیک رہا تھا تو دوسرے ہاتھ تاپنے میں مشغول تھے - اسی دوران میں ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ قیامت صغریٰ سے کم نہ تھا انقلاب، جنون اور دیوانگی کا ایک طوفان ہوتا ہے - وحشیانہ ہنگاموں کا ایک سیلاب ہوتا ہے جو آن کی آن میں ہر اُس چیز کو بہا لیجاتا ہے جو اس راہ میں حائل ہوتی ہے انقلاب ان حیوانی قوتوں کی کارفرمائی کا نام ہے جو کسی قانون یا ضبط و نظم سے مانوس ہی نہیں ہوتیں -

نئی حکومت قائم ہوئی - نئی حکومت کے ساتھ نئی طرزِ معاشرت کی داغ بیل ڈالنے کے لئے ایسے ہادیانِ طریقت کی ضرورت تھی جن کی عقلیں نئی روشنی سے منوّر ہوں جو اس بادیہ ضلالت میں شمعِ ہدایت کا کام کرسکیں - یہ ہادی و رہبر تمدن کی رفتار تیز اور سریع کردیتے ہیں، اور ہر شخص میں ایک نفسی تبدیلی پیدا ہوجاتی ہے جس کا سبب تین باتوں میں سے ایک ضرور ہوتا ہے -

(۱) ضروریاتِ زندگی (۲) آب و ہوا اور جغرافی حالات کا اثر (۳) علوم و فنون، صنعت و حرفت، مذہبی عقائد زمانہ اپنی رفتار کے مطابق شاعر اور ادیب پیدا کرتا ہے - چنانچہ ایسے وقت میں ظاہر ہے کہ دلّی نے کن موتیوں کی حفاظت کی ہوگی - شعرانے کیا کیا ہوگا - دلّی کو چھوڑ کر اب لکھنؤ کی طرف قدم بڑھایا جائے - ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ نے ہندوستان کے چپّے چپّے میں بے چینی کی ایک لہر دوڑا دی تھی - محمد شاہ کے دور میں مرکزِ اردو دہلی تھا جس کی حالت آپ کے سامنے پیش کی جاچکی ہے - جب دہلی اُجڑی تو نوابینِ اودھ کی ضیافتیں شروع ہوئیں - لکھنؤ آباد ہوا - ہر فن کے صاحبِ کمال وہاں جمع ہوئے - لکھنؤ رشکِ گلزار ہوگیا - علم و حکمت میں خطۂ یونان تھا - شعر و سخن میں شیراز و

اصفہان سے کم نہ تھا۔ دولت کا دریا بے دریغ بہہ رہا تھا۔ آخر ہر چیز کی انتہا ہوتی ہے۔

پھر کمالے را زوالے، لکھنؤ پر بھی آفت آئی۔ آندھی ہندوستان بھر کی فضا کو مکدر کئے ہوئے تھی، وہ لکھنؤ کو کیسے چھوڑتی۔ لکھنؤ کی نزاکت تہ خاک ہوئی شہزادے انگلینڈ بھیجدئے گئے۔ گوروں کے گھوڑوں نے اس کی شان کو پامال کر دیا۔ لکھنؤ بھی ایک چھاؤنی ہو گئی۔ ایک دم کایا پلٹ ہو گئی۔

غرض اس وقت ہندوستان کی کوئی قوم، کوئی ریاست و حکومت اطمینان کا سانس نہیں لے رہی تھی۔ مصائب کا ایک پہاڑ سب پر ٹوٹ پڑا تھا۔ آفتوں میں ہر چھوٹا بڑا گرفتار تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں جب کہ نہ دہلی وہ دہلی تھی اور نہ لکھنؤ وہ لکھنؤ۔ نہ آگرہ وہ آگرہ کس کو شعر و شاعری کا خیال ہوا ہوگا۔ مگر نہیں ایسا نہیں ہوا۔

شعر و شاعری کا شباب طوائف الملکوکی ہی میں ہوتا ہے۔ یہ پودا نشو و نما ہی ہوا کے تند جھونکوں میں پاتا ہے۔ جس قدر ہوا تیز ہوتی جاتی ہے۔ اس کی جڑیں مضبوط ہوتی جاتی ہیں۔ چنانچہ ہماری اردو شاعری بھی اس اصول سے باہر نہیں۔

جملہ اصناف سخن میں غزل گوئی شاعری کی سب سے لطیف صنف ہے۔ اس کی طبیعت میں کچھ لاابالی پن ہے یہ طفلِ ادب جب دوسروں کو روتا دیکھتا ہے تب ہی اس کا جی بہلتا ہے۔ ہر زمانے کا ادب اپنے ماحول کی تصویر ہوتا ہے۔ ادب ماحول نہیں بلکہ ماحول ادب وضع کرتا ہے۔ ماحول نے غزل گوئی کو اپنا ہم نوا بنا لیا۔

غزل کسے کہتے ہیں غزل کے لغوی معنی عورتوں سے بات چیت کرنا ہیں لیکن اصطلاح میں اس صنف سخن کو کہتے ہیں جس میں عاشق و معشوق کے خیالات، عشقیہ ذکر وصل، شکایات، فراق، درد انگیز و المناک حالت گفتگو ایسی بے تکلف اور صاف گویا وہیں دونوں بیٹھے بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ جس میں شیفتگی و فریفتگی کا اظہار ہو۔

انقلاب سے پہلے ہر صنفِ شعر کی پیدائش سادگی پر ہوتی تھی۔ بعد میں اس کا ارتقا مضامین کے اعتبار سے کم ہوا۔ زبان کے اعتبار سے ہر ایک میں اُلجھاؤ اور ظاہری شان و شوکت بڑھتی گئی۔ سادگی سے پیچیدگی کی طرف ترقی اردو شاعری کا عام اصول معلوم ہوتا ہے۔

غزل گوئی اس اصول کے ماتحت آ گئی۔ بہرکیف چونکہ اس صنف سخن کے اوصاف سے ایک قنوطیت کا لگاؤ معلوم ہوتا ہے اس لئے دیکھنا ہے کہ انیسویں صدی کی غزل گوئی اس عہد کی اہرمن قنوطیت کی کہاں تک آئینہ دار رہے۔

ایک انگریز مصنف رقم طراز ہے "فنونِ لطیف اپنی پیدائش اور صحت بخش نشو و نما کے لئے تازہ و نعمت کا ماحول چاہتے ہیں"۔ اردو غزل گوئی نے دکن کی بے پایاں دولت میں آنکھیں کھولیں۔ محمد شاہ کی شاہانہ فیاضی میں پرورش پائی اور بچپن کی آخری خدمت شاہانِ اودھ کی کرم فرمائی نے سرانجام دی۔ اب یہ بچہ لاابالی تھا ـــــــ شاعروں کی محفل میں اپنا دل بہلا رہا تھا۔ اپنی شوخ و چنچل طبیعت سے امراء کی تفریح کا سامان بنا تھا، مگر پھر بھی ایک لفظ قنوطیت کا متحمل تھا۔

میر تقی میر آگرہ کے رہنے والے تھے۔ یوں تو بچپن ہی سے طبیعت صوفیانہ تھی؟ دنیا میں اُن کا دل لگتا ہی نہ تھا۔ عنفوان شباب سے آفتوں کا نشانہ تھے۔ جوانی میں بھی مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹا، تو بڑھاپے کا کہنا ہی کیا۔ عنفوان شباب میں دہلی مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ آہ! اس کی آنکھوں نے دلی کی بہار کو اُجڑتے دیکھا تو کیسے اُس کے منھ سے واہ نکلتی۔ کہتے ہیں ؎

سرہانے میر کے آہستہ بولو　　ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

جذبات کی سچی عکاسی جس قدر اس شعر میں ہے کسی میں نہیں۔ یہ ایک سچے دل کا نالہ ہے۔ بچہ رونے روتے تھک جاتا ہے اور بالآخر سو جاتا ہے۔ اسکو دوسرے کا بولنا بھی اچھا نہیں معلوم ہوتا ہے، چہ جائیکہ شور و غل حقیقت یہ ہے کہ محمد شاہی عہد کے اس بوڑھے نے اپنی دولت لٹتے دیکھی۔ مرہٹہ گردی میں شرفا کی مفلوک الحالی اور تباہی کی تصویر دیکھی۔ اپنی زندگی کا پورا نقشہ حسب ذیل شعر میں کہتے ہیں ؎

عہدِ جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند　　گویا رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا

شاعر کا دل پبلک کی اندرونی حالت کا آئینہ ہوتا ہے۔ جوانی ایک نشہ ہوتی ہے جس میں انسان کو ساری فضا مخمور نظر آتی ہے۔ ہر چیز میں ایک کیف و سرور ہوتا ہے۔ پانی کی لہروں میں جذبات کی روانی ہوتی ہے۔ چمن کے سوکھے سے پتے بھی درس عشق دیتے ہیں۔ غرض شاعر اس تصویر کے دوسرے رُخ کا مبلغ ہے۔ جوانی اور رات کا تعلق، بڑھاپے اور دن کی تشبیہ کس قدر نیچرل ہے۔ پھر تمام منازل قدرت و فطرت کو جمع کر کے، جوانی میں رونا، بڑھاپے میں آنکھ موندنا حقیقی جذبات کی عکاسی ہے۔ معلوم ہوتا ہے اس زمانے میں ہر شخص انتہائی تکلیف میں مبتلا تھا اور اپنی پریشانی سے عاجز آ کر اپنی موت کا طالب ہوتا تھا جس کو میر صاحب الزام سے بچانے کے لئے نیچرل موت کا رنگ دیتے ہیں۔ اس موت میں راحت ہے۔ چنانچہ رات بھر بے چینی رہی اس کے بعد آرام ہوتا ہے۔

ادب اور زندگی میں گہرا تعلق ہے۔ جب دہلی میں زندگی دشوار ہو گئی۔ تو اصحاب فنون نے اپنا رُخ لکھنؤ کی طرف کیا۔ سب کے قدم اُکھڑ گئے، مگر میر صاحب دلی میں قدم جمائے بیٹھے رہے۔ چنانچہ جب پانی سر سے اونچا ہو گیا۔ تو ساٹھ سال کی عمر میں لکھنؤ آئے۔ یہاں آ کر دیکھا، آصف الدولہ کا زمانہ تھا۔ وہ بھی انگریزوں کے ہاتھ کٹھ پُتلی تھا۔

زندگی سے عاجز تھے، اس لئے لکھنؤ کے ایک گوشہ میں ایک کچا مکان خرید ا اور اُسی میں زندگی گذار دی۔ درحقیقت میر صاحب کی زندگی جس کو صحیح طور پر لکھنؤ اور دہلی کی متحدہ زندگی کہا جا سکتا ہے، اس کا سچا نمونہ ہے۔ مختلف اشعار اس عہد کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں ؎

جس جگہ آنسو گرے ہے آبلہ پڑ جائے ہے ۔۔۔ آب سے آتش ہوئے کیونکر ہم کیا جانئے

پوچھتے کیا ہو شبِ ہجر کی حالت یارو ۔۔۔ میں ہوں اور رات ہے اور بسترِ تنہائی ہے

اس زمانہ میں ہر شخص کے دل پر جو گذرتی تھی وہ اس شعر سے ظاہر ہے۔ شبِ ہجر کی حالت کا ذکر واقعی لاجواب تشبیہہ ہے۔ ہر شخص ایک دل رکھتا ہے۔ اس کی واردات سے واقف ہوتا ہے۔ تشبیہہ اگر نیچرل ہوتی ہے تو وہ بآسانی سمجھ میں آجاتی ہے۔ جذبات کی تحریک کا اس سے بہتر کوئی نقشہ نہیں۔ مصیبت میں کوئی کسی کا نہیں ہوتا۔ چنانچہ اس شعر میں جو کیفیت اور ما شہ ہے۔ وہ شاید ہی کسی میں موجود ہو۔ دوسرے ؎

خوشتر آں باشد کہ سِرِ دلبراں ۔۔۔ گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

اردو شاعری صدہا اعتراضات کا نشانہ بنی ہوئی ہے۔ چنانچہ کوتاہ نظر اس کو بہت ہی محدود زاویۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں اور بدنام کرتے ہیں کہ اس کے اندر ہجر و وصال و فراق، گل و بلبل کی داستان کے کچھ نہیں۔ اس میں تمدن کی جھلک نہیں یہ اعتراض سرتاپا غلط ہے۔ سوال صرف سمجھ پر ہے۔ جیسا سمجھئے شعر ویسا ہی بن جائے گا۔ قصورِ عقل کا اعتراض شاعری پر ۔

میر صاحب کے نزدیک نفس کی آمد و رفت ہی قنوطیت کی روانی ہے۔ رجائیت تو گویا زندگی میں ہے ہی نہیں۔ دنیا سے تنگ آ کر انسان موت کو اپنی نجات کا ذریعہ سمجھ سکتا ہے مگر نہیں۔ دم کا نکل جانا بھی باعثِ تسکینِ خاطر نہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں ؎

غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا ۔۔۔ دم کے جانے کا نہایت غم رہا

دل نہ پہنچا گوشۂ داماں تلک ۔۔۔ قطرۂ خوں تھا مژہ پہ جم رہا

چند نمونے میر صاحب کے اسی ذیل میں زیرِ قلم ہیں ؎

جہاں کے فتنے کو خالی کبھی نہیں پایا ۔۔۔ ہمارے وقت میں آفتِ زمانہ ہوا

دل و دماغ کس کو اب زندگانی کا ۔۔۔ جو کچھ کہ یاں ہے افسوس ہے جوانی کا

نظر میر نے کیسی حسرت سے کی ۔۔۔ بہت روئے اس کی رخصت کے بعد

راسخ ۔ غرض اسی طرح میر صاحب کا پورا دیوان انیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں درد کا سچا مرقع، دل کی

سچی کسک پیش کرتا ہے۔ غلام علی راسخ کا نام بھی اسی صدی کی غزل گوئی میں یادگار ہے۔ یہ عظیم آباد پٹنہ کے رہنے والے تھے۔ لکھنؤ میں شعر و شاعری کا چرچا تھا۔ بھانت بھانت کا جانور یہاں پر موجود تھا۔ بلبلیں کلیلیں کر رہی تھیں۔ راسخ بھی لکھنؤ میں آرہے اور میر کو اپنا کلام دکھایا۔ بھلا استاد کا رنگ شاگرد پر اثر کیسے نہ کرتا۔ حضرت شاد نوائے وطن میں کہتے ہیں۔

"دہلی کا ورق زمانہ الٹ چکا تھا۔ میر و مرزا بھی وطن سے منہ موڑ کر لکھنؤ میں آئے تھے۔ شیخ صاحب بھی وہیں پہنچے۔ میر صاحب کی ملاقات کا حد سے زیادہ اشتیاق تھا۔ پوچھتے پوچھتے ان کے دروازہ پر پہنچے۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ میر صاحب اہل دنیا سے متنفر ہو کر گوشۂ عافیت میں بیٹھ چکے ہیں۔ دروازۂ طلب و تعلقات بند کر چکے ہیں۔ شیخ صاحب گھڑیوں دروازہ پر کھڑے رہے۔ بہت تامل کے بعد ملاقات ہوئی۔"

آپ پر صوفیت کا رنگ طاری تھا۔ گل و بلبل کے افسانوں میں صوفی و صافی کے قلب کی صحیح مرقع کشی کی ہے چنانچہ کہتے ہیں ؎

دلِ بلبل نہ تنہا چاک ہے اس عشق کے ہاتھوں — یہ وہ ہے جس سے گل کے بھی گریباں کو قبا پایا

میر صاحب کی طرح معلوم ہوتا ہے کہ راسخ کا بچپن تو سکون و اطمینان سے گزرا مگر جب جوانی نے قدم آگے بڑھائے تو ان کے دل پر چوٹ لگی۔ میرے خیال میں یہی وہ زمانہ تھا جبکہ وہ لکھنؤ آئے ہوں گے اور یہاں کی زبوں حالی پر خون کے آنسو بہائے ہوں گے۔ چنانچہ کہتے ہیں ؎

جوانی رو کے کاٹی اب پلک پر اشک چمکے ہیں — جو رات آخر ہوئی نکلا ستارہ صبح پیری کا

غزل کے اندر شیفتگی کا ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ عشق کی سچی واردات کا بیان غزل کا پہلا مقصد ہے۔ غزل گو کا فرض ہے کہ اپنے جذبات کو اس طرح بیان کرے کہ بات پوری نہ ہوئی ہو اور سننے والا پھڑک اٹھے۔ ایک موقع پر کہتے ہیں ؎

اپنا بھی ماجرائے دل ایک مرثیہ سا ہے — بے اختیار روتے ہیں لوگ اس بیان پر

حقیقت ہے کہ یہ دنیا کی تمام رونق جذبات کی وجہ سے ہے۔ زندگی زندہ دلی کا نام ہے۔ چنانچہ راسخ کی مندرجہ بالا تصویر حزن و ملال کا ایک مرقع ہے یہ زندگی ایک یاس و درد کا مجموعہ ہے۔ ایسی سنسنی خیز کہانی جس کے سننے کے ساتھ ہی سننے والوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں علاوہ وہ غریب بے اختیار ہو کر رو پڑتا ہے۔ کیسا ہی سنگدل کیوں نہ ہو، مگر اس قنوطی عالم میں آکر وہ بھی موم ہو جائیگا۔ آگے چل کر کہتے ہیں ؎

ہوئے ہیں ناتواں ایسے کہ جینا تک بھی بھاری ہے — اٹھا سکتے نہیں بے طاقتی کا بار بھی اب ہم

راسخ کے بعد ناسخ کی نازک خیالی اپنا سکہ جماتی ہے۔ شیخ ناسخ محمد تقی فیض آبادی کے یہاں ملازم تھے۔

زیادہ عرصہ نہ گزرا کہ لکھنؤ شیرازِ ہندوستان بن گیا۔ اطراف و اکناف کے شعرا جمع ہوئے۔ ناسخ بھی لکھنؤ پہنچے اور میر کاظم کے یہاں رہنے لگے۔ وہ ایک فطری شاعر تھے۔ زمانہ کے نشیب و فراز نے اُن کو بھی دو چار ہچکولے دیئے۔ ایک وقت تھا کہ یہ ترقی کی بالائی منزل پر سے دوسروں کا مذاق اُڑاتے تھے۔ پھر کچھ ماحول سے متأثر خود بھی ہوئے۔ ممکن ہے کہ ان پر زمانہ کی گردش کا کم اثر ہوا ہو لیکن پھر بھی قنوطیت اور یاس جو اس صدی کی خاص خصوصیت ہے۔ ان کی غزل میں موجود ہے۔ بفرض محال نہ ہوتی تو وہ غزل سوز و گداز سے محروم ہو کر درباری گویئے کے گانے سے زیادہ اہمیت نہ رکھتی۔ کہتے ہیں ؎

محفل سے میں جو آیا تو برائے میکشی — تھا جو شیشہ جوشِ مے سے فوارہ ہوا

جام، سبو، مے، شیشہ وغیرہ کے تذکرہ کے ساتھ تصویرِ عالم کا دوسرا رُخ یوں کھینچتے ہیں ؎

چین سے سویا نہ دنیا میں کبھی جز خوابِ مرگ — بعد مرنے کے جنازہ مجھے گہوارہ ہوا

وہ جانتے ہیں کہ اگر پیالہ خنداں ہے تو صراحی اس کی بے ثباتی پر چار آنسو بہاتی ہے بلکہ قلقل کے نالوں کے ساتھ اس پر روتی ہے بقول شاعر ع "ہنسی کے ساتھ یاں رونا ہے مثلِ قلقلِ مینا"۔ جب انسان کا مقصود حاصل نہیں ہوتا، سلطنت کی بربادی اس کی امیدوں کا استیصال ہوتی ہے تو وہ عاجز آ کر مرنا پسند کرتا ہے اور کہتا ہے کہ انسان غیر مستقل تو ہے ہی۔ جب مرنا ہی مقصدِ حیات ہے تو پھر یہ سب گورکھ دھندے کس لئے۔ اور پھر یاس و مایوسی کا دیو جب دیدہ پھاڑتا ہے تو وہ انتہائے یاس میں کہتا ہے یہ ناسخ کی زبان سے سنئے ؎

اے اجل ایک دن آخر تجھے آنا ہے ویسے — آج آتی شبِ فرقت میں تو احساں ہوتا

شیخ صاحب نے دنیا کی سچی تصویر کا رُخ دیکھ لیا اور بے اختیار منہ سے نکل پڑا ؎

رنگِ عشرت باغِ عالم میں نظر آتا نہیں — گل کو گلچیں کا خطر بلبل کو غم صیاد کا

باوجودیکہ ہر قسم کا عیش نصیب تھا، ہر طرح آرام تھا، نوابین کی مرافقت تھی مگر پھر بھی بادِ حوادث سے بے خبر نہ تھے، کہتے ہیں ؎

تابِ سننے کی نہیں بہرِ خدا خاموش ہو — ٹکڑے ہوتے ہیں جگر ناسخ تری فریاد سے

خوش بختی میں تو سب ہی ساتھ دیتے ہیں۔ دولت تو شیرہ ہے جس پر بہت سی مکھیاں جمع ہو جاتی ہیں۔ مگر لطفِ دوستی تو جب ہے کہ کوئی غرض نہ ہو اور مصیبت میں ایک دوسرے کے ہمرکاب ہوں لیکن ناسخ زمانے کی شکایت فرماتے ہیں ؎

سیہ بختی میں کب کوئی کسی کا ساتھ دیتا ہے — کہ تاریکی میں سایہ بھی جدا ہوتا ہے انساں سے

ناسخ کے ساتھ آتش کی فروگذاشت کرنا بھی غلطی ہوگی۔ یہ صاحب سخن دہلی کا باشندہ تھا۔ شجاع الدولہ کے زمانے میں اپنے والد کے ساتھ فیض آباد آ رہے۔ ابھی ہوش و حواس ٹھکانے بھی نہ ہوئے تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا، اور یہ بچہ لاابالی ہوگیا۔ سپاہیوں کی صحبت میں پڑ گیا۔ بچپن سے مصیبتوں نے دلیر کر دیا اور غزل کے گداز کے لائق ہوگیا۔ آتش کی بلند پروازی اور مضمون آفرینی اُن کی استادی کی مہر لگاتی ہے۔ نان نفقہ ایک معمولی وظیفہ سے چلتا تھا۔ باقی توکل علی اللہ، بڑھاپے میں بھی غریب کو چین نہ ملا۔ چنانچہ صاحب گل رعنا ان کی بابت لکھتے ہیں کہ:

"بڑھاپے میں اندھے ہوگئے تھے۔ اسی دوران میں بیوی مری۔ فاقہ کشی ہونے لگی۔ دوسرے تیسرے فاقہ کی حالت میں چھلا رہن رکھکر پیٹ بھرا۔ بھنگ پینے کا چسکا عمر بھر رہا۔ سوز و گداز میں یہ ناسخ سے آگے نکل جاتے ہیں"۔

آتش کی غزل گوئی قنوطیت سے ذرا ہٹ کر اپنے ہمعصروں کے خلاف آگے بڑھتی ہے۔ ان کی غزل میں ہر اک موسم کی کیفیت، صبح و شام کا سماں، چاندنی رات کا لطف، جنگل یا باغ کی بہار، شہر کی روداد، وطن کی دلبستگی بھی موجود ہے۔ اس قسم کی منظر نگاری دوسرے غزل گویوں میں نہیں۔ چنانچہ ملاحظہ ہو ؎

شب وصل تھی چاندنی کا سماں تھا | بغل میں صنم تھا خدا مہرباں تھا

زمانہ کی حالت جب یکساں ہو جاتی ہے تو انسان اس کا عادی بن جاتا ہے۔ آتش اپنے دوستوں کے رویہ سے عاری ہو کر کہتے ہیں ؎

دوستوں سے اس قدر صدمے ہوئے ہیں جان پر | دل سے دشمن کی عداوت کا گلہ جاتا رہا

اپنی بربادی پر خود کو یوں تسلی دیتے ہیں ؎

برباد ہو رہے ہو کچھ آتش تم ہی نہیں | مٹی خراب اپنی بھی ہے اس دیار میں

اردو غزل کو جو لوگ حسن و عشق کی واردات تک محدود رکھتے ہیں وہ ذرا آتش کی غزلوں کا مطالعہ کریں۔ حقیقت میں آتش پہلے فرد ہیں جنھوں نے غزل عنوان کے ماتحت لکھی ہے۔ چنانچہ قناعت کے متعلق لکھتے ہیں ؎

شگفتہ رہتی ہے خاطر ہمیشہ | قناعت بھی بہار بے خزاں ہے

مومن اس صدی کے درخشاں موتی ہیں۔ شاعری سے طبیعت کا فطری لگاؤ تھا۔ غزل درد ناک ترنم سے پڑھتے تھے۔ کسب علم کے بعد زمانہ کے انقلاب نے ان کو شہر نوردی پر آمادہ کیا۔ چنانچہ دلی کی بربادی کے بعد پٹیالہ اور ٹونک کا طواف کیا۔ زمانہ نے خود ان کے اندر جذب و اثر کوٹ کوٹ کر بھر دیا تھا۔ ان کا ایک ایک شعر رنج و الم کی پُر اثر تصویر ہے۔ کہتے ہیں ؎

چھٹ کر کہاں اس پر محبت کی زندگی | ناصح یہ بند غم نہیں قید حیات ہے

تکلیف کے اندر انسان راحت کی دعا کرتا ہے حصولِ مقصد کا خواہشمند ہوتا ہے۔ مگر مومن کی حساس طبیعت دنیا کی حقیقت کو اچھی طرح پہچانتی تھی ان کو زندگانی کا ہر شعبہ پیامِ موت سے کم نہیں۔ کہتے ہیں ؎

ہیجوِ عشق تھے مو تھے دنیا کا غم نہ تھا　　　جینا وصال میں بھی مرنے سے کم نہ تھا

دنیا کے بے پایاں غم نے جب مومن کو آ دبایا تو اس نے آہ و فریاد کی فغاں کی مگر سب نالے بے سود و بے اثر رہے چنانچہ عاجز آ کر کہتے ہیں ؎

مانگا کرینگے اب سے دعا ہجرِ یار کی　　　آخر کو دشمنی ہے دعا کو اثر کے ساتھ

اپنی زندگی اور بے بسی کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں ؎

کسی نے گر کہا مرتا ہے مومن　　　کہا میں کیا کروں مرضی خدا کی

ہندوستان کی اس بدحالی پر گوشہ گوشہ ماتم کر رہا تھا۔ دلی ایک چھاؤنی سے زیادہ نہ تھی حتیٰ کہ غالب نے اس اُجڑے وطن میں اپنا بسیرا جاری رکھا۔ اس بادشاہِ غزل کے یہاں بھی فقر و فنا کی کثرت ہے۔ مایوسی و غم ایک ایک شعر سے ٹپکتا ہے۔ کوئی شعر ایسا نہیں جو زمانے کی حالت کا آئینہ دار نہ ہو۔

فلسفۂ حیات تو سب نے واضح کیا ہے مگر قید خانے کی تشبیہہ، زندگی کی پابندیاں جس لطیف پیرایہ میں غالب نے باندھی ہیں کسی نے ادا نہیں کیں۔ انھوں نے زندگی کو ہی آفتوں کا گورکھ دھندا بنا دیا تو کیا زمانہ کیا زمانہ کی شکایتیں۔ کہتے ہیں ؎

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں　　　موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

غالب کی زندگی کا ہر واقعہ ایک مستقل دفتر ہے اور صدہا اشعار اس حالت کا مظہر ہیں۔ جذبات کی ہوبہو تصویر غالب نے کامیابی کے ساتھ پیش کی ہے چنانچہ کہتے ہیں ؎

کوئی امید بر نہیں آتی　　　کوئی صورت نظر نہیں آتی

موت کا ایک دن معین ہے　　　نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

غرض پوری غزل میں جس سادگی کے ساتھ اظہارِ غم کیا گیا ہے واقعی قابلِ ستائش ہے پھر اپنے غم کا موردِ الزام خدا کو کس سادگی سے قرار دیتے ہیں ؎

زندگی اپنی جو اس رنگ میں گزری غالب　　　ہم بھی کیا یاد کرینگے کہ خدا رکھتے تھے

زندگی میں جب پے در پے مصیبتیں پڑیں اور دلی کی بود و باش سے تنگ آ گئے، تو کہنے لگے ؎

یاد تھیں ہمکو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں　　　لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ عصیاں ہوگئیں

انسانی زندگی رنج و آلام کا مستقل نشانہ ہے۔ جب انسان کی حالت یکساں طور پر گذرتی رہتی ہے تو رنج و غم کا اطلاق اور اس کی تفریق بالکل مٹ جاتی ہے۔ اس حقیقت سے بھی غالب بے خبر نہیں۔ کہتے ہیں ؎

رنج کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج   مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

غرض غالب کا دیوان بھی انیسویں صدی کا ایک اجڑا ہوا دفن ہی ہے جس کے لئے غالب کا شعر ہے ؎

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے   دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

قنوطیت کا غلبہ اس قدر طاری ہے کہ عشق و محبت کے معاملات میں بھی فتنہ۔ فساد کی تماثیل پیش کی جاتی ہیں ؎

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق   نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

استاد ذوق بھی اس صدی کے مایۂ ناز شعرا میں سے ہیں مگر انہوں نے میدانِ قصیدہ گوئی میں جو طرۂ امتیاز حاصل کیا وہ کسی کو میسر نہیں ۔ پھر بھی ان کی غزلوں کو پس پشت ڈالدینا انصاف کا خون کرنا ہوگا۔ ذوق کو حالانکہ زمانہ کا فراغ حاصل تھا۔ بادشاہِ وقت کی استادی کا شرف تھا، مگر وہ بھی زمانہ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور کہہ گئے ؎

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے   اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

دنیا سے جب عاجز آتے ہیں تو قنوطیت ان کی خاطر کرتی ہے۔ کہتے ہیں ؎

کبھی افسوس ہے آتا کبھی رونا آتا   دلِ بیمار کے دو ہی ہیں عیادت والے

ان کا دیوان بھی اس قسم کی تصویر پیش کرتا ہے۔

مذکورۂ بالا شعرا کا خیر جو حال تھا سو تھا شہزادوں پر بھی وہ رنگ طاری تھا۔ ان محل پر چلنے والوں کو دنیا کی کیا خبر۔ ان نازو نعم کے پلے ہوؤں کو رفتار زمانہ سے کیا سروکار۔ مگر نہیں۔ بگڑے ہے جب ساز تو نکلے ہی صدا بگڑی ہوئی لال قلعہ خود اپنی لٹی ہوئی ثروت پر گیروا لباس پہنے تھا۔ ظفر شاہ نے ماتمی لباس پہنا اور خود ان کی طبیعت نے کہا ؎

ہم اپنے کنج غم میں نالہ و فریاد کرتے ہیں   ہمیں کیا گر چمن میں چہچہا ہے عندلیبوں کا

وائے حسرت و ناکامی۔ تیرا ہی آسرا۔ حقیقی جذبات کا عکس ظفر نے کس پیرایہ میں ادا کیا ہے۔ خیر پھر بھی اپنی ناکامی پر اظہارِ تشکر فرماتے ہیں ؎

دنیا میں بلا سے اگر آرام نہ پایا   ہم نے یہی پایا کہ برا نام نہ پایا

اس صدی کی غزل گوئی کی شبستان میں امیر و داغ کی شاعری چراغِ سحری ہے۔ امیر صاحب فرماتے ہیں ؎

دیکھ اے درد نہ جدا ہو دلِ محزوں سے   اور اُلجھے گا یہ بیمار جو تنہا ہوگا

اپنی مایوسی کا سماں یوں دکھاتے ہیں ؎

نہ کرلے یاس یوں برباد میرے خانۂ دل کو   اسی گھر میں جلایا ہے چراغِ آرزو برسوں

فقیر اگر مایوسی کا اظہار کرے تو اس کی عادت ہے لیکن کھاتا پیتا انسان اگر قنوطیت کا سانس لے گا تو کسی حقیقی جذبہ کے تحت ہوگا۔ اب تک ہم نے مختلف شعرا کے کلام کا نمونہ دیکھا ان میں سے بیشتر کی زندگی خانہ انی فقر و فاقہ کا شکار رہی، مگر ہمارا داغ خود تخلص ہی داغ کئے ہوئے تھا۔ وہ لال قلعہ میں پرورش پایا ہوا۔ لاڈ و پیار سے پلا ہوا، عوام کا شاعر گنا جاتا ہے۔ اس کا ہر شعر تعیش کا پیش خیمہ ہے مگر پھر بھی اُس کے منہ سے نکلتا ہے ؎

خدا جانے ہوئی ہیں دفن کیا کیا حسرتیں اس میں   پھپھولوں سے مرے سینہ پہ عالم ہے مزاروں کا

اپنی شاعری کے متعلق خود لکھتے ہیں ؎

وہی جھگڑا ہے فرقت کا وہی رونا ہے الفت کا   تجھے اے داغ کوئی اور بھی افسانہ آتا ہے

انیسویں صدی کے اتنے شعرا کا کلام ہماری نظر سے گزرا۔ سب میں بالاتفاق ایک قنوطیت، حسرت و مایوسی، سوز و گداز، حیرت و استعجاب کی ایک لہر موجود پائی۔ اردو شاعری کے بڑے بڑے غزل گو بھی اسی عہد میں ملتے ہیں، تو معلوم ہوا، انیسویں صدی کی فضا اردو غزل گوئی کے لئے مناسب تھی۔ صد ہا مضامین اسی صدی میں داخل ہوئے۔ غزل کو اس قسم کا رنگ آتش کی جادو بیانی کا عطیہ ہے۔

ان تمام باتوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ قنوطیت اور غزل گوئی میں گہرا تعلق ہے۔ جو اس دور کی شاعری میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ ہندوستان کی طوائف الملوکی نے شاہد ادب کی زیب و زینت میں چار چاند لگا دئیے ‡

(بقیہ صفحہ ۴۰)

بے نیازی غم اور مسرت دونوں سے ہوسکتی ہے اور اس لئے قہقہہ شانِ بے نیازی اور اغیار لا پرواہی کہا جا سکتا ہے۔ قہقہہ کا نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ آنسو نکل آئیں۔ یہ آنسو سکونِ قلب بھی ہوتے ہیں۔ اور رُلانے میں معاون بھی اور ان ہر دو حالتوں کی انتہا کے لئے قہقہہ۔ قہقہہ کو علامتِ دیوانگی بھی کہا جاتا ہے۔ لیکن نازیہ اس وقت ہوتا ہے کہ ناز پرور کی دنیا بے نیاز سے بھی بلند ہو۔ اور عقلیت غالی اس دیوانگی کی کچھ ہی ہو نتیجہ میں دیوانہ کہیگا کہ اچھا "منہ نہ دکھلا دے نہ دکھلا پر بہ اندازِ عتاب۔ کھول کر پردہ ذرا آنکھیں ہی دکھلا دے مجھے"۔ اور آنکھیں دیکھنے کے بعد کہیگا " وفائے دلبراں ہے اتفاقی ورنہ اے ہمدم اثر فریادِ دلہائے حزیں کا کس نے دیکھا ہے"۔ آپ کیا سمجھیں۔ انگریزی میں اس قسم کے کردار کے لئے ایک لفظ "کریزی" ہے ‡

عبدالسبحان اعظمی عمری

دعوتِ عبادت

زمین پر سبزہ زاروں کا اُگنا اور اُن پر موتیوں کی طرح شبنم کے قطروں کا ہونا، نسیم سحری کا اُن سے اٹکھیلیاں کرنا، اُن کا لہلہانا اور مستانہ وار جھوم جھوم کر ایک دوسرے سے گلے ملنا، موسم بہار کا ہزاروں دل فریبیوں کے ساتھ آنا، درختوں کا ہرا بھرا ہو جانا، نئی نئی کونپلوں کا نکلنا، کلیوں کا چٹکنا، پھولوں کا کھلنا اور مہکنا، پھر بلبلوں کا اس پر چہکنا، کالی کالی بدلیوں کا اِدھر سے اُدھر دوڑنا، بجلیوں کا کوندنا اور غائب ہو جانا، بارش کا چھم چھم ہونا، سرد ہوا کے جھونکوں کا چلنا، پپیہا کا پی ہو، کوئل کا کو کو کرنا، فلک نما پہاڑوں کا سبز دوشالوں کا اوڑھنا، پہاڑ کی چوٹیوں پر برف کا روئی کے گالوں کی طرح جمنا اور پھر پگھلنا، آبشاروں سے پانی چھلکنا اور گرنا، پرندوں کا اس کے گرد قطار باندھ کر منڈلانا، خوشنما باغوں میں نوخیز درختوں اور پودوں کا ہونا اور اُن کے گرد حلقہ باندھ کر صنوبر اور سرو کا پہرا دینا، عروسِ صبح کا زرق برق لباسوں میں خراماں خراماں آنا، آسمان کا لاجوردی پردہ کا اوڑھ لینا، آفتاب کی سنہری کرنوں کا رقص کرتے ہوئے اونچے اونچے درختوں، پہاڑ کی چوٹیوں اور فلک نما عمارتوں سے چھیڑ چھاڑ کرنا، نیلگوں آسمان پر تاریکی چھا جانا پھر چاند کا نکلنا، چاندنی کا چٹکنا اور آسمان و زمین پر چاندنی فرش کا بچھ جانا، ہمو کے میدان میں رات کے سناٹے میں چاند کی شوخ کرنوں کا سبزہ زاروں میں ننھے ننھے پودوں سے سرگوشیاں کرنا، سمندر کے ساحلوں پر لطیف ہواؤں کا چلنا، موجوں کا جنگ کرنا، اُٹھنا اور گرنا، ساحلوں سے آکر ٹکرانا، آبِ زلال کے صاف و شفاف چشموں اور نہروں کا دوڑنا، پرندوں کا غسل کرنا اور پروں کو جھاڑنا، سرسبز و شاداب جنگلوں میں نیل گایوں کا کلیلیں کرنا، ہرنیوں کا چوکڑیاں بھرنا، نوخیز درختوں پر چھوٹی چھوٹی چڑیوں کا پھدکنا، اونچے اونچے درختوں پر خوش الحان طائروں کا اپنے نشیمنوں میں بیٹھ کر نغمہ سنجی کرنا، فضائے محیط کا گونجنا، ابر کا آنا، موروں کا گانا اور ناچنا، جنگلوں کے پُر پیچ راستوں سے چشموں کا بہنا، باغ کی چھوٹی چھوٹی کیاریوں میں، بیلا، چنبیلی، موگرا، چمپا، نرگس، ننھے ننھے درختوں کا ہونا، اُن میں پھولوں کا کھلنا اور عطر بیزی کرنا، تتلیوں اور صحراؤں پر عشق پیچاں کی بیلوں کا پھیلنا، پھولوں کا کھلنا اور جاذبِ نظر ہونا، ہرے ہرے خاردار درختوں میں سرخ اور سفید گلابوں کا کھلنا اور خوشبو پھیلنا، ننھے ننھے اَن گنت تاروں کا فضائے آسمانی میں بکھرنا، فنا ہونا اور پھر اُبھرنا۔

دنیا جو ایک عالیشان محل ہے، جس کی عمارتیں نہایت ہی بلند اور اس کا حلقہ نہایت ہی وسیع ہے اس کی چھت کو

دیکھئے تو عجائب و غرائب کا مجمع، زرد و نذی کی پچی کاریوں اور گل بوٹے کی گل کاریوں سے مزین، لولو و مرجان سے مرصع گوناگوں دلفریب رنگوں سے آراستہ، ہر جانب فانوس و قندیل آویزاں، کبھی ایک دم تاریکی کا ہو جانا پھر اس میں چھوٹے چھوٹے موتیوں کا ہلکی ہلکی روشنی دینا اور یک بیک صاف و شفاف روشنی کا نمودار ہو کر ان چھوٹے چھوٹے موتیوں پر پھیل جانا اور فضائے آسمانی میں چاندنی کا دوڑ جانا،

فطرت کے وہ تمام مناظر جو دل میں پُرکیف سرور ناقابلِ بیان نشاط، دماغ میں بلند پروازی، طبیعت میں اُمنگ اور ولولہ، احساسات میں تازگی، جذبات میں حیات فکر میں جولانیت، شعور میں سرعت اور پہلو میں گدگدی پیدا کرتے ہیں فطرت کی یہ تمام نیرنگیاں اور رعنائیاں کس کے لئے ہیں؟

اے انسان دیکھ، یہ سب تیرے لئے ہیں۔ اپنے منعمِ حقیقی کی شان رحیمیت کو ملاحظہ کر، کس شفقت کے ساتھ کہہ رہا ہے وَلَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا۔

اے انسان ضعیف البنیان! فطرت کے ان گرانقدر احسانات سے، تیرے جسم کا ہر ہر عضو، جوڑ جوڑ، بال بال، رُواں رُواں دبا ہوا ہے، تو نے اگر ان احسانات کی قدر نہ کی تو تجھ سے بڑھ کر ناشکرا کون ہوگا؟

اُٹھ اپنے معبودِ حقیقی کی بارگاہ میں اپنی جبینِ نیاز خم کر دے اور اُس کی توحید و تمجید، تسبیح و تقدیس اور تہلیل میں نغمہ سنجی کر۔

آئندہ شمارہ کے لکھنے والے

۱۔ علامہ محوی صدیقی لکھنوی

۲۔ اخگر گلشن آبادی

۳۔ حیدر علی خاں حیدر آکیڈوی

۴۔ سیدہ اختر حیدر آبادی

۵۔ مس صفیہ سلطان قریشی. بریلوی

۶۔ حکیم سید محمد ابراہیم رزمی

۷۔ نذیر رحمانی

۸۔ محسوس ہبلی

ان کے علاوہ ہمارے مستقل قلمی معاونین کا تازہ کلام اور مضامین بھی ملاحظہ فرمائیے۔

اصغر حسین مدیر، طابع و ناشر نے
علوی پریس بھوپال سے شائع کیا
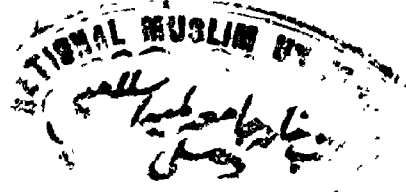
ادارہ

تعمیر ادب بھوپال

اردو کی ہر ممکن خدمت کے لئے قائم کیا گیا ہے
اس ادارہ سے جلد ہی ملک کے منتخب اور سربرآوردہ
شعرا کے کلام کے مجموعے اور دیگر تصانیف
منظر عام پر آنے والی ہیں۔

تجابات قصر و عام عشرت رنگ گفتنا

ملتِ بول ورد ویش کی رکھو بنیاد

ہنگا ہمالہ

سالانہ
صہ

قیمت
ہر

دار الاشاعت تعمیر ادب

تعمیر ادب ——— بھوپال

وسطِ ہند کا پہلا بلند پایہ اردو زبان کی علمی، ادبی خدمت کرنے والا ادارہ

شمالی ہند میں اردو کی علمی و ادبی ترقی اور اشاعت کے لئے جو کچھ ہو رہا ہے، وہ محتاجِ بیان نہیں، مگر وسط ہند اور مغربی و جنوبی ہند میں ادب اردو زبان سے متعلق علمی و عملی کوششوں کی جو شدید ضرورت تھی وہ مدت سے محسوس ہو رہی تھی، کوئی مخصوص ادارہ نہیں تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ اس ادارہ کے قیام نے اس کمی کو ہر حیثیت سے پورا کرنے کا عزم کیا ہے۔

تعمیر ادب کے چار شعبے اس وقت سرگرم عمل ہیں:

۱۔ طباعت اور اشاعت کے لئے اعلیٰ درجے کا مکمل پریس

۲۔ زبردست بلند پایہ وسیع تجارتی کتب خانہ (بک ڈپو)

۳۔ شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ۔ جس میں انگریزی، عربی، فارسی وغیرہ کئی زبانوں سے ترجمہ کرنے کے لئے ماہرین مصروف ہیں۔

۴۔ سنجیدہ اخبارات و رسائل کا شعبہ۔ فی الحال تعمیر ماہانہ نکل رہا ہے اور ہفتہ وار خیال نکلنے والا ہے۔

(الف) آپ اپنی یا اپنے کسی عزیز و دوست کی کوئی کتاب اعلیٰ پیمانے پر چھپوانا چاہیں تو یہ خدمت اس ادارے سے لیجیے۔

(ب) اپنی یا کسی عزیز کی مطبوعات کی اشاعت و فروخت کا بندوبست کرنا چاہیں تو ادارہ یہ خدمت خوش اسلوبی سے انجام دیگا اور ملک بھر میں آپ کی مطبوعات پھیل جائینگی۔

(ج) آپ یا آپ کے کسی دوست نے کوئی کتاب تصنیف یا ترجمہ کی ہو، اور حقِ تصنیف فروخت کرنا یا خریدنا کوئی اور معاملہ کرنا چاہیں تو یاد رکھیے کہ بغیر کسی اندیشے اور خطرے کے بآسانی یہ مرحلہ ہم سے طے ہو سکتا ہے۔

(د) اس سلسلے میں ہر ممکن امداد اور مشورے کے لئے ادارۂ تعمیر ادب حاضر ہے۔

(ہ) اخبارات، رسائل، کتابیں وغیرہ بھی اس ادارے کے ذریعے چھپوائیے۔

(و) احباب کی کئی کتابیں اس وقت زیرِ طبع ہیں۔ فہرست آئندہ نمبر میں شائع ہوگی۔

(ز) تاجرانِ کتب کو مطبوعات ادارہ پر معقول کمیشن دیا جائیگا۔

(ح) اس ادارے کو ملک کے ایک مانے ہوئے فاضل مصنف اور مشہور شاعر و ادیب کی سرپرستی کا حاصل ہے۔ انھیں کی زیر نگرانی و ہدایات کام انجام پاتا ہے۔

(ط) ادارے کا کام بڑے پیمانے پر اور تیزی سے عمل میں آ رہا ہے۔

علم و ادب کا خادم: ناظم تعمیر ادب، بھوپال

ماہنامہ
تعمیر

دارالاشاعت: تعمیر ادب بھوپال

شمارہ [illegible] | بابت ماہ اپریل [illegible] | جلد ۱

سرخیاں

سرپرست

حضرت مولانا محوی صدیقی لکھنوی مدظلہ

مدیر

حامد صدیقی بی، اے (جامعہ)

فی پرچہ

آٹھ آنہ (۸)

چندہ سالانہ پانچ روپے

ایّامِ زندگی

حضرتِ مولانا محوی لکھنوی مدظلہٗ

ہیں رنج و غم سے بدتر وہ دن ہنسی خوشی کے
اپنی خودی کو کھو کر ہاتھ آئیں جو کسی کے

یوں بھی گزر چکے ہیں کچھ روز زندگی کے
باتیں سنیں کسی کی طعنے سنے کسی کے

جینے میں کیا مزہ ہے، اب کیا کرینگے جی کے
لائینگے ہم کہاں سے وہ دن ہنسی خوشی کے

یہ بھی ہے کوئی جینا، یہ دن ہیں زندگی کے
احسان لیں کسی کے، طعنے سنیں کسی کے

گزری جہاں جوانی، راتیں مزے مزے کی
اب بھی طواف کرتے رہتے ہیں اس گلی کے

پھولوں کی ہو وہ شہرت، یا ہو پھلوں کی کثرت
احسان ہیں چمن میں سب پر کلی کلی کے

گو اپنی زندگی نے پلٹے بہت سے کھائے
دم بھرتے ہیں اُسی کا، کہلاتے ہیں اُسی کے

وہ بادہ کش نہ ساقی، وہ ہم نہ وہ جوانی
اب کیا کرینگے جی کے، اب کیا کرینگے پی کے

بربادئ محبت ، ناکامئ تمنا!
ہیں کیسے کیسے دشمن، بیچارے آدمی کے

اب ہمکو دیکھ کر وہ سب ہاتھ مل رہے ہیں
دیکھے جنھوں نے برسوں ٹھاٹ اپنی زندگی کے

وہ چند سخت لمحے یارب نہ پھر دکھانا
محوی کے دل پہ گزرے جو تیری برہمی کے

تری شانِ کریمی یا الٰہی!

حضرت ابو داؤد لکھنوی

محبت یہ تری عالی نگاہی — فقیری میں نظر آتی ہے شاہی
بہار آئی تو اپنی بے گناہی — کیا کی میکدہ میں خانقاہی
تری کیا بات ہے اے خیرخواہی — نہ پوری ہو سکی جو تو نے چاہی
ادھر بھی اے نگاہِ بے نگاہی — مجھے تسلیم تیری بے پناہی
ہماری عاشقی میں جلوہ گر ہے — حسینانِ جہاں کی کج کلاہی
فریبِ رنگ و بو گہرا ہوا اور — نمو کے جوش میں سبزہ ہے کاہی
تری زلفوں کو بھی چمکا رہی ہے — مرے اعمالنامے کی سیاہی
فراقِ یار! میں نے زندگی بھر — جہاں تک نبھ سکی تجھ سے نباہی
زمانہ ڈھونڈنے نکلا ہے مجھکو — کہاں پہنچا ہوں اے گم کردہ راہی
مریضِ غم پہ بھاری ہے شبِ غم — اب اس کی زندگی کا ہے خدا ہی
دکھائی دے رہے ہیں دن میں تارے — ابھی تک ہے شبِ غم کی سیاہی
دیا ہے دل کو کب دردِ محبت — تری شانِ کریمی! یا الٰہی!

ابو داؤد کو کیا پوچھتے ہو؟
پھرا کرتا ہے جو واہی تباہی

شاعر کی تربت پر

راحتؔ کوٹی

چمن کے ایک گوشے میں شکستہ جو مزار ہے کوئی نہ دیکھے اُس طرف کہ عبرت آشکار ہے
سرہانے نسترن کھڑی ملول و سوگوار ہے جو عندلیب نالہ کش تو نرگس اشکبار ہے
یہ اتفاق تھا کہ میں برائے فاتحہ گیا
مگر بجائے فاتحہ زباں سے یہ ادا ہوا

یہ محوِ خواب خاک پر وطن کا تاجدار ہے خدا کی خاص رحمتوں سے آج ہمکنار ہے
یہ موت موت ہی نہیں سرورِ بادہ خوار ہے فضول اس کو حشر کا ابھی سے انتظار ہے
یہ کہہ کے دیکھتا ہوں کیا کہ قبر میں ہیں لرزشیں
فضائے خامشی میں کچھ ہیں دھیمی دھیمی شورشیں

ندا یہ آئی سنئے کچھ زبانِ لالہ زار سے کہ رنگِ فکر ہے عیاں ہر ایک برگ و بار سے
صدائے سوز گونج کر اٹھی ہے کوہسار سے مرا ترنم آشکار ہے ہر آبشار سے
جو سو رہے تھے بے خبر انھیں بھی باخبر کیا
تمام کائنات کو پیامِ حق سنا دیا

چھپے ہوئے جو راز تھے جہاں پہ منکشف ہوئے گدا کو اور شاہ کو جدا جدا سبق دیئے
جو شعر تھے شراب کے مری بیاض سے لئے وہ دیکھو مست آگئے اچھوتے جام مے پیے
وہ جن کے سینوں میں کبھی بجائے قلب سنگ تھے
مری نوائے درد سے چلے ہیں جھومتے ہوئے

ہر ایک راہِ سخت کو بنا چکا ہوں موم سا سمندروں کی سطح پر پھرا ہوں تیرتا ہوا
اب اپنا کام ختم کر کے لے رہا ہوں دم ذرا سناؤں اپنا نغمہ کیا سنا چکا ہوں بارہا
مرے سپرد آج ہیں زمیں کی ساری رفعتیں
زمیں کی رفعتیں تو کیا فلک کی ساری عظمتیں

فرمانِ ابلیس

اپنے سفیر کے نام

ضیا احمد ضیا ہانی
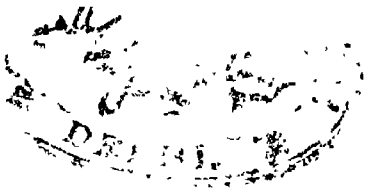
چشمِ دور اندیش سے نورِ بصیرت چھین لو
ہوشمندوں سے خرد آموز طاقت چھین لو

ڈال دو، بیداریوں کے رُخ پہ غفلت کی نقاب
دل کے ہر گوشے سے احساسِ حرارت چھین لو

خوف سے پیدا کرو، رعشہ دلِ مزدور میں
قبضۂ سرمایہ داری سے مروّت چھین لو

تیرہ و تاریک ہی رہنے دو "بزمِ دہر" کو
آفتابِ صبح سے نور و صباحت چھین لو

خندہ ہائے لالہ و گل اور گلشن کی بہار
عندلیبِ نغمہ پیرا سے مسرت چھین لو

خاک کر دو مزرعِ امید، برقِ غیظ سے
بازوئے دہقاں سے فیضانِ مشقت چھین لو

برہمن کے دل میں بھر دو عصرِ حاضر کی فضا
فرقِ صوفی سے یہ دستارِ فضیلت چھین لو

نقش ہائے رہروانِ راہ کر ڈالو خراب
کارواں کے میر کی شانِ قیادت چھین لو

نوچ لو پر طائرِ فکرِ فلک پرواز کے
ہو ہلاکت خیز جس کی بھی جسارت چھین لو

رہبرانِ پاک طینت کو بنا ڈالو حریص
زر کا لالچ دیکے پاسِ ملک و ملت چھین لو

منزلِ مقصد کی خاطر جو ہو سرگرمِ خرام
راہِ منزل ہی میں سب اُسکی فراست چھین لو

گردو یکسر بندِ تخئیلِ فراست کی سبیل
"شاعرِ بیباک" سے حسنِ فصاحت چھین لو

تاکہ دنیا پر مسلط "دورِ محکومی" رہے
"آرزومندانِ آزادی" کی ہمت چھین لو

ہندستان کے دو انقلابی شاعر

حضرت فہمی ترمذی

یادِ ایام کہ بے ہوش تھی بیمار تھی قوم
مرضِ جہلِ مرکب میں گرفتار تھی قوم

خوگرِ بے جا تعلّی کی گنہگار تھی قوم
مست و مدہوشِ مئے نخوت و پندار تھی قوم

نہ تو پروائے زیاں اور نہ فکرِ بہبود
زعمِ باطل تھا مگر یہ "پدرم سلطاں بود"

پیشۂ صنعت و حرفت کو سمجھتے تھے حقیر
نہ تجارت کا سلیقہ تھا، نہ زر کی تدبیر

ادب و شعر و زباں، علم کی یہ تھی تفسیر
شاعری بھی وہ جو وحشت کی مکمل تصویر

غیر مربوط بیاں، اور پریشان خیال
تھا یہی شعر و سخن آپ کا معراجِ کمال

ادعائے ہمہ دانی کی فراوانی تھی
یا نسب اور شرافت کی ثنا خوانی تھی

لن ترانی ہدفِ طعنۂ نادانی تھی
خندۂ کفر سے محجوب مسلمانی تھی

چارہ گر صورتِ تصویر تھے، حیران مشفق
شکر ہے مل گئے حالی سے طبیبِ حاذق

آپ نے جب نظرِ غور و توجہ ڈالی
حالتِ زار سے تشخیصِ مرض فرمالی

بہرِ اصلاح اٹھے وجہِ خرابی پالی
لکھ دیا نسخۂ نایاب مسدسِ حالی

جس کا ہر جزو شفا بخش و سریع التاثیر
زہر کے واسطے تریاق، مرض کو اکسیر

تیز تھا نشہ تو ترشی کو بھی کچھ تیز کیا
سخت تھا حملۂ امراض تو دی تلخ دوا

بڑھ گیا ضعف مگر زور مرض کا جو گھٹا
غلبۂ دل پہ ہوا یاس و قنوطیت کا

ہو گیا فرطِ نقاہت سے جو بیمار نڈھال
لائے کچھ قوت و طاقت کی دوائیں اقبال

حالِ بیمار نقاہت سے جو ابتر دیکھا
پے بہ پے زود اثر چند دیے جامِ شفا

ہو گیا غش سے افاقہ جو سنی بانگِ درا ۔۔۔ بالِ جبریل نے کچھ تاب و تواں کی پیدا

یاس کا زور گھٹا، قلب ہوا اپر امید ۔۔۔ بن گیا نامۂ جاوید، حیاتِ جاوید

بیخودی کے وہ رموز اور وہ اسرارِ خودی ۔۔۔ عزتِ نفس کا احساس، وہ معیارِ خودی

درس حریت و خودداری و اظہارِ خودی ۔۔۔ خود شناسی کی وہ تعلیم، وہ اشعارِ خودی

رازِ قوت ہیں یہی تاکہ بہ اندازِ قدیم ۔۔۔ پھر وہی مردِ مجاہد ہو، وہی ضربِ کلیم

مئے مغرب سے جو لبریز تھا جامِ مشرق ۔۔۔ تھی فرنگی زدگی مخمرِ غلامِ مشرق

سن کر اس نازشِ مشرق سے پیامِ مشرق ۔۔۔ روحِ مشرق ہوئی بیدار بنامِ مشرق

وہ زبورِ عجم و زمزمۂ خوش آہنگ ۔۔۔ جس سے باطل ہوا آخر اثرِ سحرِ فرنگ

للہ الحمد کہ وہ گوہرِ تابانِ حجاز ۔۔۔ گلِ شادابِ وطن، زینتِ دامانِ حجاز

لے کے آیا بہ عقیدت پئے رندانِ حجاز ۔۔۔ ارمغاں بادۂ سر جوشِ خمستانِ حجاز

جس کا ہر جرعۂ پر کیف، خرد کی تمہید ۔۔۔ شارحِ ملت و آئینۂ تہذیبِ جدید

جانِ تہذیب ہے افعال کی آزادیٔ عام ۔۔۔ احتسابِ عمل و فکر ہے روحِ اسلام

نوعِ انساں میں ادھر عدل و مساوات تمام ۔۔۔ اس طرف نام کو آزاد، حقیقت میں غلام

وجہِ ترجیح یہاں نسل ہے، دولت ہے، نہ رنگ ۔۔۔ دولت و رنگ و نسب، مایۂ آئینِ فرنگ

وطنیت جو کرے عدل و مساوات سے دور ۔۔۔ اور اقوام کا جب خود غرضی ہو دستور

جب کہ تقسیم ہو مخلوقِ خدا کی منظور ۔۔۔ ایسی تفریق سے وہ مردِ مسلماں ہیں نفور

ورنہ اس کی وطنیت میں کسے جائے سخن ۔۔۔ دیوتا ہو جسے ہر ذرہ ہر خاکِ وطن

خواہ حالی ہوں کہ اقبال وہی ایک ہے بات ۔۔۔ گو جدا طرزِ بیاں اور جدا ہیں حالات

گھونٹ کڑوے ہیں ادھر اور ادھر قندِ نبات ۔۔۔ قول ان کا ہے جو اکسیر، تو یہ آبِ حیات

اس طرف آہ، ادھر واہ، جواں یہ، وہ پیر
ہیں غرض حالی و اقبال نذیر اور بشیر

سراج الشعراء حضرت سراج لکھنوی

رو دینے کو جی اکثر چاہا ہنستا ہی رہا رویا تو نہیں
میں اور خیالِ ترکِ وفا، توبہ توبہ ایسا تو نہیں

ہے کوئی ضرور پسِ پردہ، دھوکا ہے، نہیں ایسا تو نہیں
محسوس نظر اک جلوہ ہے پہچانتے ہیں دیکھا تو نہیں

فکرِ عقبیٰ کی قسم واعظ، یکسوئی سی ہو جاتی ہے
دو گھونٹ گلے سے اتر جائیں جو اسکے غمِ فردا تو نہیں

جلوہ کہ زیبِ جلوہ ہے آنکھوں کا بھرم تو قائم ہے
دامن میں نگاہِ حسرت کی اک پھول تو ہے کانٹا تو نہیں

یہ دل ابتک کانپ اٹھتا ہے تھوڑی سی جھجک باقی ہے ابھی
کیوں میری گناہ کی تاریکی دنیا نے مجھے دیکھا تو نہیں

پلکوں کی نازک چلمن سے چھنتی ہیں محبت کی کرنیں
رنگینیِ دل کی شہ پاکر ہیچ ہے آنسو رکتا تو نہیں

اب چھاؤں گھنی زلفوں کی کہاں ہر دھوپ ہی دھوپ مقدر میں
جس دن سے چھٹا زانو تیرا ان آنکھوں میں خواب آیا تو نہیں

خود حسن کی جانب سے پہلے کیوں اک دلکش تحریک نہ ہو
یہ جذبۂ خودداری میرا، توبہ اتنا سستا تو نہیں

ابتو ہر ٹھنڈی سانس میں ہم افسانۂ دل کہہ جاتے ہیں
رونا تو سراج اس بات کا ہے سننا ہی جسے سنتا تو نہیں

فریبِ ہستی

آسیؔ مہناس

خاک ہونا دلیلِ ہستی ہے
کس بلندی پر اپنی پستی ہے

کاوشِ عشق دل کی ہستی ہے
جان دیکر ملے تو سستی ہے

میری ہستی بھی کوئی ہستی ہے
زندگی موت کو ترستی ہے

کوئی سمجھا نہ آج تک یہ راز
ہر نفس اک فریبِ ہستی ہے

پھر بھی ساحل پہ جاکے دم لینگے
گو تلاطم میں بحرِ ہستی ہے

یاد آتا ہے کوئی مستِ شباب
جب گھٹا جھوم کر برستی ہے

ایک سے ایک ہوگیا بیزار
یہ زمانے کی چیرہ دستی ہے

کوچۂ عشق میں یہ راز کھلا
زندگی کیا ہے غم پرستی ہے

حسن مغرور عشق محوِ نیاز
اک بلندی ہے ایک پستی ہے

جسکو کہتے ہیں زندگی آسیؔ
یاس و غم کی وہ ایک بستی ہے

سرخ آنسو

عرشؔ بدایونی

وہ پہلو میں ہیں اور جاری ہیں آنسو
غم و لطف ہیں آج پہلو بہ پہلو

شگوں کے محبت میں ہیں دو ہی پہلو
کبھی چند آہیں کبھی چند آنسو

قضا تو نہیں ہے شریکِ شبِ غم
یہ کیوں آج بے رونقی سی ہے ہر سُو

محبت میں بے چارگی کا یہ عالم
نہ تم میرے بس میں نہ دل پر ہی قابو

تم آؤ جدائی میں یا موت آئے
سکوں کا کوئی تو نکل آئے پہلو

مجھے تم سے مل کر یہ کیا ہوگیا ہے
کہ تھمتے نہیں میری آنکھوں سے آنسو

فغاں میں اثر اور کیا چاہئے اب
فلک بھی بہاتا ہے شبنم کے آنسو

اٹھی اور اٹھتے ہی پیوستِ دل تھی
تمہاری نظر تھی کہ تھا کوئی جادو

تری غم نوازی کے قربان اے دل
شبِ ہجر میں داد بن کر رہا تو

وہ در اصل اے عرشؔ تھے دل کے ٹکڑے
اطبّا نے سمجھا جنھیں سرخ آنسو

ڈاکٹر محمد عرفان شوکت جونپوری

شامِ تخریب!

یہ نظم برادرِ عزیز عرفان شوکت صاحب نے اپنے شفیق والد مرحوم کے سانحۂ وفات سے متاثر ہو کر کہی ہے۔ انسان کے لئے یہ غم بہت بڑا غم ہے۔ ہمیں موصوف سے دلی ہمدردی ہے اور ہم بھی اس جانکاہ حادثے میں شریکِ غم ہیں۔ اللہ بزرگوار مرحوم کو جنت نصیب فرمائے اور مرحوم کے اعزہ خصوصاً جناب شوکت کو صبر کی توفیق دے۔ آمین! ——— ادارۂ تعمیر

آخرش آج میں آلام سے گھبرا ہی گیا
زندگی کی سحر و شام سے گھبرا ہی گیا
دل گرانباریٔ ایام سے گھبرا ہی گیا

کیا کروں اب تو مرا کوئی سہارا بھی نہیں
میری منجدھار میں کشتی ہے کنارا بھی نہیں
زندہ رہتا میں تمنا کے سہارے کب تک؟
دیکھتا گردشِ دوراں کے نظارے کب تک؟
چیختا آہ نہ میں درد کے مارے کب تک؟

ساغرِ ضبط کو اک روز چھلکنا ہی تھا
آتشِ غم کو بہرحال بھڑکنا ہی تھا
مجھکو گرتے ہوئے دیکھا تو سبھی نے لیکن
وہ سہارا مجھے دیں، اب نہیں اُن سے ممکن
یہ بتائیں تو ذرا اب مجھے میرے محسن
کون ہے جس نے دیا بڑھ کے سہارا مجھکو
کون ہے جس نے محبت سے پکارا مجھکو

میں ہوں اب اور مرے ساتھ ہے "شامِ تخریب"
اور اس حال میں آتا ہی نہیں کوئی قریب
کیا گلہ کس کا گلہ، رب کی خوشی، میرے نصیب
کاش مجھ پر کوئی ایسی نہ عنایت کرتا
اس طرح سے نہ گرفتارِ مصیبت کرتا

اب تو سب جالِ محبت کا مگر ٹوٹ گیا
وہ مکاں، اور وہ محل، اور وہ گھر ٹوٹ گیا
حسن کے لطف و کرم کا وہ اثر ٹوٹ گیا
دور ہی مجھ کو بس اب اہلِ کرم رہنے دیں
جھوٹی ہمدردیوں کا مجھ پہ ستم رہنے دیں

بے نتیجہ ہے تری اشک فشانی شوکت
دردِ غم ہی سے بنی تیری کہانی شوکت
کھا نہ جائے تجھے یہ سوزِ نہانی شوکت
زندگی اپنی غم و فکر میں برباد نہ کر
یونہی ناشاد ہے دل اور اسے ناشاد نہ کر

حریمِ ناز

شیخ داؤد عاشق کساروی

حریمِ ناز کے اللہ رے رسوم و قیود
کہ پاسبان کے قدموں پہ ہم ہیں سر بسجود

جنونِ عشق میں دل کو ہوا جو ذوقِ سجود
بتوں کی صف سے اٹھا نعرۂ انا المعبود

وہ حسن جس کی لطافت پہ ناز عصمت کو
وہ میرا دل جو سراپا ہے معصیت آلود

مجھے وہ سنگِ درِ یار جب نظر آیا !
تڑپ اٹھی ہے جبیں میں کمالِ شوقِ سجود

ہزار عقل و خرد نذرِ کیف و مستی ہیں
نشیلی آنکھ کو پاتا ہوں میں خمار آلود

ترا جمال تو آرائشِ جہاں بن جائے
عذابِ جان و جگر ہے مگر ہمارا وجود

وہ میرا مرشدِ کامل ہے عشقِ زیں جس نے
زمینِ نجد میں پایا تھا گوہرِ مقصود

تمہارے نقشِ کفِ پا کی واہ رے قسمت
جسے بھی دیکھئے وہ ہو رہا ہے سر بسجود

عجیب حسن عجب ہے ادا و نازِ شباب
ادھر نگاہ ادھر ہے مری زباں پہ درود

نگاہِ قہر بھی ساقی کی کیا قیامت ہے
کہ اپنے ہاتھ میں پاتا ہوں جامِ خوں آلود

شباب آنے میں ہے دیر اور یہ عالم
ابھی سے رنگِ چمن نے اڑا کسی کا وجود

خدا کے واسطے یہ عزمِ ترک کر عاشق
حریمِ ناز میں ننگِ ادب ہے تیرا وجود

بیانِ اردو

آسان ہے آسان بیانِ اردو

معجزۂ زندہ زبانِ اردو

افسانے

ابر احسنی گنوری

نفس نفس پہ فغاں کر رہے ہیں دیوانے
قدم قدم پہ نئے بن رہے ہیں افسانے

نکل چکے ہیں علاجوں کی حد سے دیوانے
کہیں تمھیں کو اب آنا پڑے نہ سمجھانے

کہیں بصورتِ گل ہو کہیں ہو شعلۂ طور
جو رنگ یہ ہے تو کس طرح کوئی پہچانے

نظر وہ بزم میں اُٹھی اور اس طرح اُٹھی
کہ جیسے رہ گئے لُٹ کر ہزار میخانے

جہاں بجائے قبا سینہ چاک ہوتا ہے
اب اُس زمیں پہ قدم رکھ رہے ہیں دیوانے

نکال لی ہے سمجھ کر یہ راہِ آزادی
قیودِ ہوش سے باہر نہیں ہیں دیوانے

ہر ایک گوشۂ دل میں نقوشِ صد ارماں
ہمارے کعبہ میں پنہاں ہزار بتخانے

جنونِ عشق کی عظمت کو جب سے سمجھا ہے
متاعِ ہوش کو ٹھکرا رہے ہیں دیوانے

مذاقِ سوز سے آگاہ کیوں نہیں انساں
لگی ہے اپنی جلے جا رہے ہیں دیوانے

دلوں کے ضبط پہ ہنس کر دلوں کی آہ نہ لے
کسے خبر کہ چھلک جائیں کب یہ پیمانے

نفس کی آڑ سے مخصوص اہتمام کے ساتھ
بلا رہا ہے مجھے کون یہ خدا جانے

ملی جو اُن سے نظر، پھر گیا رُخِ ہستی
بدل کے رہ گئے عنواں کے ساتھ افسانے

رموزِ حسن و محبت کا علم تھا کس کو
بنا دیے تری نیچی نظر نے افسانے

ظہور ہوتا ہے پیشِ فراعنہ اس کا
غرورِ ابر کی عظمت زمانہ کیا جانے

آ بتاؤں تجھ کو رمز آیۂ اِنَّ الملوک
سلطنت اقوامِ غالب کی ہے اک جادوگری
خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
پھر سُلا دیتی ہے اُس کو حکمراں کی ساحری

اقبال

زبانِ اضطراب

باسط بھوپالی

اللہ اللہ وحشتِ دیوانگانِ اضطراب ــــ ان کے دامن پر بھی لکھدی داستانِ اضطراب

ورنہ پھر مشکل ہے ضبطِ امتحانِ اضطراب ــــ درد سے پہلے تڑپ سے ناتوانِ اضطراب

دور ہی رہنا مرے دل سے بس اے برقِ کرم ــــ ایک نازک شاخ پر ہے آشیانِ اضطراب

وہ تو کچھ ان کی نگاہ لطف کی تاثیر ہے ــــ ہجر میں تنہا نہ تھا شایانِ شانِ اضطراب

کیوں یہ تلقینِ سکوں ناصح ابھی آئیں تو وہ ــــ خود بدل جائیگی ترکیب فغانِ اضطراب

یہ خوشی اک وقفۂ تیاریٔ سامانِ غم ــــ ہر سکوں مہلت برائے امتحانِ اضطراب

دیکھیے کیا حشر ہوتا ہے پیامِ شوق کا
رازہائے دل ہیں باسط اور زبانِ اضطراب

یادِ رفتہ

آغا نوری دُرّانی جالندھری

وہ دن بھی کیا تھے، جب اسلاف تھے گرمِ عمل اپنے ــــ کہیں اُن کا کوئی ثانی نہ تھا آفاق گیری میں

ہمیشہ ظلمتوں سے برسرِ پیکار رہتے تھے ــــ نہ طفلی میں جھجکتے تھے نہ وہ تھکتے تھے پیری میں

مگر یہ کیا ہوا، پیدا ہوا ذوقِ تن آسانی ــــ فقیرانہ روش کو بھول بیٹھے ہم امیری میں

سکندر اور دارا بھی ترستے رہ گئے جس کو ــــ حکومت کا مزہ وہ ہم نے چکھا ہے فقیری میں

کبھی بھولے سے لب پر نامِ آزادی نہیں آتا ــــ اسیروں کا یہ عالم ہو گیا طولِ اسیری میں

نہیں ہمت تو بن جاؤ چراغِ زیرِ دامن ہی ــــ رہو محفوظ آفاتِ جہاں سے گوشہ گیری میں

زیانِ زندگی ہے یہ مذاقِ خود فراموشی ــــ جو ہو ہمت، تو ممکن پھر تمنا سے ہم آغوشی

تجاہل

سہیل بخاری، بی اے

(۱)

اک خلا ہے جس طرف بھی دیکھتا ہوں غور سے
اک کمی محسوس ہوتی ہے مجھے ہر طور سے
تشنگی جیسے زمیں کو آسماں کے جور سے
جانے گزری جارہی ہے زندگی کس دور سے

(۲)

چار سو چھایا ہوا ہے ایک گہرا سا غبار
حسرتوں پر یاس کی پرچھائیوں کا انتشار
موت کے بستر پہ جیسے بوجھل آنکھوں کا خمار
جانے گزری جارہی ہے زندگی کس دور سے

(۳)

تنگ ہوتا جارہا ہے عرصۂ دورِ شعور
حافظے کی اُف یہ کمزوری! یہ انساں کا دفور
ہو رہی ہے پاس کی ہر ایک شے اب دور دور
جانے گزری جارہی ہے زندگی کس دور سے

(۴)

پر شکن سی ہوتی جاتی ہے بساطِ بزمِ دل
یا سمٹتی آرہی ہے کائناتِ آب و گل
ایک ضیقِ روح جیسے اک فشارِ مستقل
جانے گزری جارہی ہے زندگی کس دور سے

(۵)

بے تعلق سا ہوا جاتا ہوں گردوپیش سے
جیسے مفلس بے زری کی آفتِ دلریش سے
چھوٹ جاتا ہے وطن میں اقربا و خویش سے
جانے گزری جارہی ہے زندگی کس دور سے

(۶)

زندگی کا وہ قرینہ ہی نہیں وہ ڈھب نہیں
کائناتِ ہوش میں حصہ تھا لیکن اب نہیں
یعنی دنیا کے کسی گوشے سے کچھ مطلب نہیں
جانے گزری جارہی ہے زندگی کس دور سے

(۷)

کچھ نہیں معلوم مجھ کو کونسی منزل میں ہوں
مبتلا ہوں سخت آفت میں عجب مشکل میں ہوں
کوئی میرے دل میں ہے یا میں کسی کے دل میں ہوں
جانے گزری جارہی ہے زندگی کس دور سے

(۸)

ہمنشیں سے ہمنشیں اور اس قدر نا آشنا
آنسوؤں سے آنکھ، سوزش سے جگر نا آشنا
ہائے یہ عالم کہ اب دل ہے اثر نا آشنا
جانے گزری جارہی زندگی کس دور سے

(۹)

بیخودی ہی بیخودی طاری ہے تحریکات پر
اک جمودِ مستقل تخئیل واحساسات پر
اوس جیسے پڑ گئی ہو نوجواں جذبات پر
جانے گزری جارہی ہے زندگی کس دور سے

(۱۰)

ایک سناٹا کہ ہنگاموں کا امکاں جس میں ہے
اک سکوتِ شام صبحِ حشر پنہاں جس میں ہے
اک بھیانک خامشی ہیجانِ طوفاں جس میں ہے
جانے گزری جارہی ہے زندگی کس دور سے

(۱۱)

یہ تعطل حاصلِ فتحِ عزائم تو نہیں
یہ جمود وبے حسی اک کیف دائم تو نہیں
گردشِ ایام اک مرکز پہ قائم تو نہیں
جانے گزری جارہی ہے زندگی کس دور سے

(۱۲)

یہ سکوں ہے یا سرانجامِ شکستِ آرزو
برق سے جھلسی ہوئی اک کشتِ زارِ رنگ و بو
جس کی خاکستر میں آسودہ ہے دنیائے نمو
جانے گزری جارہی ہے زندگی کس دور سے

شانِ محبت

قابل ادھونوی

ساقی مئے عرفاں کا کوئی جام پلادے
اے جذبۂ دل عشق کا اعجاز دکھا دے
مائل بہ ستم روزِ ازل ہی سے ہے کوئی
ایسا نہ اُٹھا ہوگا جہاں میں کوئی طوفاں
ہمراہ مری آہ کے وہ خود نکل آئیں
اے جانِ ستم مزرعِ دل خشک ہے کب سے

دیدار کی حسرت کے سوا جو ہے مٹا دے
آہ شبِ غم عرش کی زنجیر ہلا دے
توفیق اسے خیر کی اب کچھ تو خدا دے
اے دیدۂ تر خوبیٔ قسمت کو دعا دے
اے دردِ جگر شانِ محبت وہ دکھا دے
آ برقِ تبسم کے شراروں سے جلادے

بے قدر کا دینا بھی ہے دینا کوئی قابل
دولت وہی دولت ہے جو بے مانگے خدا دے

شاعرِ مشرق سے

گوہر جلالی

السلام اے شاعرِ مشرق سخن کے تاجدار!
آج تیری یاد میں اہلِ وطن ہیں سوگوار
چل بسا افسوس تجھ سا ترجمانِ زندگی
ایشیا کی جان مشرق کی رگِ ہستی تھا تو
آمدِ سلطانیِ جمہور کے پیغامبر

السلام اے ہند کے اقبال مسلم کے وقار!
کونسی ہے آنکھ ایسی جو نہیں ہے اشکبار
ڈھا دیا دستِ اجل نے آسمانِ زندگی
ہر نظر میں تھی بلندی دشمنِ پستی تھا تو
اس قدر جلدی وطن سے پھیر لی تو نے نظر

اے مسیحا قوم کو تیری ضرورت تھی ابھی
زیست کی انفاسِ ہستی میں حرارت تھی ابھی

آئی اک آواز سن گوہرؔ ذرا خاموش ہو
میں بتاؤں، کیوں مرے اشعار میں تاثیر ہے
درسِ حریت دیا میں نے وطن کو ٹھیک ہے
کھینچتے ہو تم مری بیرنگ تصویریں بہت
سال میں اک وقت مجھکو یاد کر لیتے ہو تم
قوم کا پیغام بر کہتے رہے ہو تم مجھے

پونچھ آنسو، بند کر نوحہ سراپا گوش ہو
شاعری میری کتابِ پاک کی تفسیر ہے
مشعلِ حق کی عطا، اس انجمن کو ٹھیک ہے
اور مرے اشعار کی لکھتے ہو تفسیریں بہت
آنسوؤں کی محفلیں آباد کر لیتے ہو تم
علم کا شمس و قمر کہتے رہے ہو تم مجھے

کیا دیا مجھکو مری محنت کا پھل یہ تو کہو
کیا، کیا پیغام پر میرے عمل یہ تو کہو

سچ بتاؤ صورتِ شاہین کیا تم ہو گئے
وہ تمہاری داستانِ خونچکاں ہی کیا ہوئی
کیا تمہاری حکمرانی ہے جہانِ کفر پر؟
کیا زمیں سے آسماں ہو تم بتاؤ تو مجھے
ہے غلط نعم البدل میرا نظر آتا نہیں

جاگ اٹھے یا ذرا کروٹ بدل کر سو گئے
گرمیِ ایماں جو تھی تہ دل میں نہاں وہ کیا ہوئی
کیا مہِ حق ضو فگن ہے آسمانِ کفر پر؟
اے مسلمانو! کہاں ہو تم بتاؤ تو مجھے
خود بخود دریا کے سینے پر گہر آتا نہیں

ہے تعجب مہرِ حق میں روشنی کا کال ہے
یاد رکھو ہر مسلماں ورنہ اقبال ہے

تضمین برنظم حضرت اقبال علیہ الرحمۃ

حضرت نائل بنگلوری

دکھائی دے رہا ہے سب ترا اندوہ و زیاں مجھکو — نظر آتا ہے تیری خستہ حالی کا سماں مجھکو
کیا ہے فکرِ مستقبل نے تیری نیم جاں مجھکو — رُلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھکو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں

جسے دیکھو نظر آتا ہے اب مایوس و غم آگیں — عنادل کے لہو سے ہوگیا ہے سب چمن رنگیں
پڑی ہے پھوٹ باہم مٹ گئی گلزار کی تزئیں — نشانِ برگِ گل تک بھی نہ چھوڑا باغ میں گلچیں
تری قسمت سے جھگڑے ہو رہے ہیں باغبانوں میں

زمانہ آج نالاں ہے ستم کی تیغ رانی سے — کہ سب کو سامنا ہے اب بلائے ناگہانی سے
زبانِ خلق ہے محرومِ عیش و شادمانی سے — جہاں خوں ہو رہا ہے کارزارِ زندگانی سے
مئے غفلت کے ساغر چل رہے ہیں نوجوانوں میں

بہت تیاریاں اے چارہ سازو کی ہیں گردوں نے — نگاہیں اہلِ گلشن سے بہت بدلی ہیں گردوں نے
نئے انداز کی بربادیاں سوچی ہیں گردوں نے — چھپا کر آستیں میں بجلیاں رکھی ہیں گردوں نے
عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں

ہر اک تحریکِ راحت ہی میں آفت آنے والی ہے — بشکلِ خیر شاید اب ہلاکت آنے والی ہے
نظر آتا ہے کچھ ایسا قیامت آنے والی ہے — وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

ترے حق ہی میں کانٹے کوئی ظالم بونے والا ہے — کہ تو اپنے ہی ہاتھوں اپنے گھر کو کھونے والا ہے
زمانہ تیری بربادی پہ آخر رونے والا ہے — ذرا دیکھ اسکو جو کچھ ہو رہا ہے ہونے والا ہے
دھرا کیا ہے بھلا عہدِ کہن کی داستانوں میں

رہائی کی کوئی صورت بھی اے ناشاد پیدا کر — دکھا ہمت کے جوہر فطرتِ فولاد پیدا کر

قفس میں بال و پر اے طائرِ آزاد پیدا کر — یہ خاموشی کہاں تک لذتِ فریاد پیدا کر
زمیں پر تو ہو اور تیری صدا ہو آسمانوں میں

جہاں کی ٹھوکریں کھاؤگے اے ہندوستاں والو — تغافل کی سزا پاؤگے اے ہندوستاں والو
کئے پر اپنے پچھتاؤگے اے ہندوستاں والو — نہ سمجھوگے تو مٹ جاؤگے اے ہندوستاں والو
تمھاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

ہماری آنکھ سے پردہ تغافل کا اُٹھایا ہے — تماشا دورِ حاضر کا ہمیں اچھا دکھایا ہے
ہمیں اقبال نے بروقت مائل یہ سنایا ہے — تغیر اس طرح کا محفلِ ہستی میں آیا ہے
کہ ہے چُپ بیٹھ رہنا بھی تباہی کے نشانوں میں

بلائے ناگہانی

قیامت ڈھانے والی کس کی یہ عالم جوانی ہے
کہ جس کی ہر ادا آئینہ دارِ داستانی ہے
[illegible] آغازِ جوانی ہے
بہت جوشِ جنوں پر ہے ابھی دل [illegible]
مگر آنے ہی والی اک بلائے ناگہانی ہے
[illegible] نشانی ہے
بہار داغِ محبت دل کو دیجے [illegible]
کھلے ہے [illegible] نشانی ہے

سمجھ لو اس سے ہمدردی کی ہی امید جانی ہے
یہ میری موت کی منت کسی ظالم نے مانی ہے
[illegible] سامنے [illegible]
وہ پوچھیں یا نہ پوچھیں نامہ بر پیغام زبانی ہے
اک آہ سرد تو بھرنا [illegible] اس عالم میں
خود اپنا دل ہی [illegible]
سمجھ اے [illegible] یہ دنیا کی روانی ہے

گوارا داغِ تنہا دیکھ [illegible] رخصت
[illegible] نشانی ہے
جب واپس [illegible] بنیاد [illegible]
لپٹ جائے [illegible] کی جوانی ہے
[illegible]
صدا آتی ہے [illegible] نشانی ہے
کہ اے [illegible]
محبت کا [illegible] یوسف [illegible] فانی ہے

یوسف سندیلوی

آشفتہ نوائیاں

اکرم وصولپوری

لطف جینے کا تڑپنے کا مزا کچھ بھی نہیں
عالمِ یاس میں حسرت کے سوا کچھ بھی نہیں

ہم ہیں بیزار زمانے سے زمانہ ہم سے
اور انجام محبت کا ہوا کچھ بھی نہیں

بوالہوس! بوئے وفا اُس میں کہاں سے آئے
جس کا دل سوزِ محبت میں جلا کچھ بھی نہیں

اُس کی رحمت پہ بھروسا ہے گنہگاروں کو
حشر میں اشکِ ندامت کے سوا کچھ بھی نہیں

وہ تو کہیے کہ غنیمت ہے ہماری ہستی
ورنہ معمورۂ عالم میں ہے کیا کچھ بھی نہیں

روز و شب درد و الم شام و سحر صدمہ و غم
کیا محبت میں اذیت کے سوا کچھ بھی نہیں

دل میں موجود اگر ہو نہ محبت کی بہار
حسن کا جلوۂ نیرنگِ ادا کچھ بھی نہیں

اے غمِ دل کی حقیقت نہ سمجھنے والے
زندگی رنجِ مسلسل کے سوا کچھ بھی نہیں

لطف تو جب ہے کہ ہو جائے تمنا سیراب
ورنہ ساون کی یہ گھنگھور گھٹا کچھ بھی نہیں

جو تری گرمیٔ محفل کا سبب تھا پہلے
اب وہی اکرمِ آشفتہ نوا کچھ بھی نہیں

ہم

حیدر آکیڈوی

ایک ہی جلوے میں غش کھا کر گرا کرتے ہیں ہم
انتہائے عشق کی یوں ابتدا کرتے ہیں ہم

برق کی بے تابیوں کا سامنا کرتے ہیں ہم
آشیاں کے چار تنکے ایک جا کرتے ہیں ہم

چاندنی راتوں کی خاموشی میں تنہا بیٹھ کر
جلوۂ قدرت کا نظارہ کیا کرتے ہیں ہم

الحذر اے جوشِ وحشت، الاماں اے جوشِ غم
موسمِ گل میں خزاں کی التجا کرتے ہیں ہم

زخمِ کاری، بیقراری، آہ و زاری کے مزے
تیر کھا کر کلیجے میں لیا کرتے ہیں ہم

اپنی آشفتہ مزاجی کو چھپانے کے لئے
خود لگا کر آگ، بجلی کا گلا کرتے ہیں ہم

میکشی اپنی رہینِ منتِ ساقی نہیں
بوند اپنے ہی لہو کی پی لیا کرتے ہیں ہم

ہم کو خطروں ہی میں ملتا ہے سکونِ زندگی
پھول کے مانند کانٹوں میں رہا کرتے ہیں ہم

ڈھونڈنے والے خرابانوں میں دیکھیں ڈھونڈ کر
بھیس میں اکثر فقیروں کے ملا کرتے ہیں ہم

خوف طوفانوں کا رہتا ہے نہ گردابوں کا ڈر
ڈوب کر دریا میں حیدر جی لیا کرتے ہیں ہم

پروفیسر مولانا عاقل صدیقی

(بسلسلۂ گزشتہ)

عدل وضعی اور عدل طبعی: قانون یا شریعت کے علماء نے عدل کی دو قسمیں قرار دی ہیں، عدل وضعی اور عدل طبعی
عدل وضعی تو وہی عدل ہے، جو دنیا کی تمام مختلف قوموں کے عمومی قانونوں میں معتبر سمجھا جاتا ہے، مثلاً برٹش قانون،
جرمنی قانون، فرانسیسی قانون وغیرہ۔ ان قانونوں میں باہم کچھ اختلاف ہے، لیکن ان کے نزدیک عدل ایک ہی ہے
اس لئے ایک ملک نے ایک قانون کو رکھا، دوسرے نے اسکو چھوڑ دیا۔ کیونکہ اس کے نزدیک یہ چیز عدل وضعی کے
خلاف تھی۔ اس سے پتہ چلا کہ عدل وضعی میں اختلاف ہو سکتا ہے، اور اس میں کچھ حرج نہیں کیونکہ وضعی قانون
ہر ملک کے ماحول اور آب و ہوا کے مطابق وضع کئے جاتے ہیں، اس لئے ان میں اختلاف ناگزیر ہے۔

اور عدل طبعی وہ عدل مطلق ہے، جسکو انسانی عقل تصور کر سکتی، اور اسکو ہر انسان کا فطرتی حق سمجھتی
ہے۔ عدل طبعی میں کسی قسم کا اختلاف نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ انسان کی فطرت کے موافق ہوتا ہے، اور دنیا کے
ہر انسان کی فطرت یکساں ہے، اس لئے قانون طبعی بھی ہر انسان کے لئے ایک ہی ہوگا۔ یہی قانون طبعی جو
کبھی بدلتا نہیں، دنیا کی ہر ایک شریعت کی اصل اور اسی پر سب کا مدار ہے۔ جیسا کہ فرانسیسی قانون ساز اپنے
مقدمۂ قانون میں لکھتے ہیں: کائنات میں ایک ایسا عدل عام پایا جاتا ہے، جو مکان و زمان کے تغیر سے بدلتا
نہیں۔ یہی عدل عام ہر قانون وضعی کی اصل ہے، فی الحقیقت وہ ایک ایسی عام روح ہے جو ساری مخلوق کو
محیط ہے۔ اسی روح عام کی تحقیق، جس سے تمام [illegible]

حقوق وضعی اور حقوق طبعی: جس طرح ایک عام عدل طبعی پایا جاتا ہے [illegible] وضعی قانونوں کا مطمح نظر ہوتا
ہے، اسی طرح عام حقوق طبعی بھی پائے جاتے ہیں، جو حقوق وضعی کے مطمح نظر ہوتے ہیں۔ حقوق طبعی تو تمام
دنیا والوں کے یکساں اور ایک ہی ہیں، لیکن حقوق وضعی، مکان و زمان اور ماحول کے اختلاف سے مختلف
ہوتے ہیں۔ جیسا کہ دنیا کے موجودہ قانون اور امتیازات سے واضح ہوتا ہے۔ مثلاً قاتل سے بدلہ ضرور
لینا چاہیے۔ یہ حق طبعی ہے، لیکن کس طرح بدلہ لینا چاہئے، اس میں حقوق وضعی مختلف ہوگئے۔ اسلام
کے نزدیک قاتل جس ہتھیار سے جس طرح اور جس جگہ ضرب پہنچائے۔ وہی طریقہ قاتل کے ساتھ اختیار

کرنا چاہیے، معاف کر دینے کا بھی اختیار ہے۔ لیکن دنیا کے دوسرے فرضی قانونوں نے اور شکلیں بیان کیں۔ مثلاً
کسی جگہ سولی دی جاتی ہے، کہیں عبور دریائے شور کی سزا ہے، کہیں برقی طاقت سے قتل کیا جاتا ہے۔ غرض
حقوق وضعی مکان و زمان اور احوال کے اعتبار سے بدل جاتے ہیں، لیکن حقوق طبعی نہیں بدلتے۔

یہاں یہ نکتہ اچھی طرح واضح ہوتا ہے کہ قانون ساز حق کا موجد نہیں ہوتا، بلکہ ہر انسان فطرتاً یہ
محسوس کرتا ہے کہ اس سماج میں جس میں، میں زندگی بسر کر رہا ہوں مجھے حق حاصل ہے۔ قانون ساز کا کام
صرف ان حقوق کا احترام اور اعتبار ہے۔ پھر اپنی معلومات اور قابلیت کے مطابق ان حقوق کی تحقیق و
تفتیش اور ان کا اجراء، تاکہ ہر شخص عدل مطلق تک پہنچنے کی کوشش کرے، جس کے بارے میں حدیث شریف
نے یہ واضح کیا کہ: "بالعدل قامت السموات والارض (آسمان اور زمین کا قیام عدل پر ہے)
جس طرح اس دنیا میں انسان کے حقوق ہیں، جن کا وہ مطالبہ کرتا ہے، اسی طرح اس پر چند فرائض بھی
عائد ہوتے ہیں جن کا اس سے مطالبہ کیا جاتا ہے۔

حق وضعی کے اقسام: علمائے تشریع نے حق وضعی کی دو قسمیں قرار دی ہیں: حق داخلی اور حق خارجی۔
یا تمام قوموں میں ایک حق عام۔ پھر حق داخلی کی تین قسمیں ہیں: حق خاص، حق عام اور حق عقابی۔ فرانسیسی
قانون ساز مونٹسکیو اپنی کتاب اصول قوانین میں لکھتا ہے: "تمام لوگوں میں اس اعتبار سے کہ وہ
کرۂ ارض کے باشندے ہیں اور ان میں مختلف قومیں آباد ہیں، چند روابط ہیں جن کا نام حقوق عام ہے۔
اور اس اعتبار سے کہ وہ ایک ایسی جماعت کے ممبر ہیں جس کی حفاظت ان کے ذمے ضروری ہے، چند
دوسرے حقوق ہیں جن کا نام حقوق مدنی ہے" اور حق عقابی وہ ہے جو مسئولیت اعمال کی بنا پر افراد کے
درمیان علاقوں کی حد بندی کی جاتی ہے مثلاً خادم و مخدوم وغیرہ۔

چونکہ اس مضمون کی تحریر سے ہمارا مقصود شریعت اسلامی کی خدمت ہے اس لئے اب ہم قطعی دلائل سے یہ ثابت کرنا چاہتے
ہیں کہ شریعت اسلامی خانہ ساز شریعت نہیں، اور اس کے قانون میں کسی طرح کے تغیر و تبدل کی گنجائش نہیں، دنیا کی
تمام شریعتوں سے زیادہ ترقی یافتہ اور اکمل ہے اور ان تمام اصول پر حاوی ہے جو ہر قوم کے نزدیک تسلیم ہیں
اور جن کو فلاسفہ عدل مطلق کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں، جن میں کچھ تغیر نہیں ہوتا۔ لیکن اس کو ثابت کرنے سے
پہلے حقوق طبعی کی تفصیل ضروری ہے، جن کو موجودہ فلاسفہ نے بہت کچھ تحقیق کے بعد ثابت کیا ہے اور ان کو
ہر شریعت کی عدالت کا معیار بنایا ہے، اگر شریعت اسلامی کے اصول ان حقوق طبعی پر منطبق ہو گئے تو پھر تسلیم کرنا پڑا

کہ انسان کے لئے قابلِ عمل یہی شریعت ہے اور یہی شریعت قانونِ طبعی کی مظہر ہے جسکو فلاسفہ اصولِ فطرت بھی کہتے ہیں۔
حقوقِ طبعی کیا ہیں ؟: حقوقِ طبعی وہ اصول ہیں، جو بمقتضائے فطرت قانون کے وجود سے پہلے انسان کو محیط ہوتے ہیں اور یہی حقوق وہ انسانی مطلوب ہیں کہ اگر کوئی قانون ان سے خالی ہو تو ناقص شمار کیا جائے گا۔
حقوقِ طبعی کی تفصیل حسب ذیل ہے :

(۱) انسان کا اول حقِ طبعی، حقِ حیات ہے۔ کسی شخص کو یہ جائز نہیں کہ ایک دوسرے کو اس حق سے محروم کرے یا خود اپنی ذات کو اس سے محروم رکھے۔ اسی حق سے حفاظتِ نفس کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص کسی پر حملہ کرے تو اُس کو اپنی ذات کے بچانے کا اختیار حاصل ہے اس بنا پر اگر یہ شخص قاتل کو نقصان پہنچانے سے قبل ہی قتل کردے تو اس پر کچھ مواخذہ نہ ہوگا۔ یہ طبعی قانون اسلام میں موجود ہے قرآن مجید نے قتلِ نفس کو مطلق حرام کیا ہے اور شخصِ واحد کے قاتل کو ایک جماعت کا قاتل قرار دیا ہے چنانچہ فرمایا: "ومن قتلها فكانما قتل الناس جميعًا" یعنی اگر کسی شخص نے ایک شخص کو قتل کیا تو گویا اس نے تمام انسانوں کو قتل کیا۔ اور خودکشی سے یوں منع فرمایا: "ولا تقتلوا انفسكم ان الله كان بكم رحيما۔ (خودکشی نہ کرو اللہ تعالیٰ تم پر مہربان ہے) - اسی طرح حدیث شریف میں اعضائے بدن کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی بھی سختی کے ساتھ ممانعت آئی ہے۔ حالانکہ قدیم شریعتوں میں خودکشی جائز تھی بلکہ رومیوں اور یونانیوں کے نزدیک آلام و حوادثِ ایام سے نجات پانے کا واحد ذریعہ بھی، ایسے وقت میں خودکشی کو نہایت ضروری سمجھتے تھے، لیکن اسلام نے اس لغویت کا دروازہ بند کردیا۔

(۲) انسان کا دوسرا حقِ طبعی یہ ہے کہ وہ دنیا میں ایک عاقل اور ہوشیار انسان کی طرح زندگی بسر کرے اور عاقل سمجھا جائے۔ اسی قانون سے آزادیٔ عقائد کا مسئلہ متفرع ہوتا ہے، شریعتِ اسلام پہلی شریعت ہے جس نے انسان کے بالغ ہوتے ہی اسکو عاقل و راشد کا خطاب دیا اور عاقل مخاطب کی طرح اسکو خطاب کیا۔ اسلامی شریعت نے عقل کا یہاں تک اعتبار کیا کہ عقائد کے اثبات میں بھی یہی طریقہ اختیار کیا اور ہر ایک مسئلے پر بے شمار عقلی دلیلیں پیش کیں نیز اپنے مخاطب کو ان دلیلوں پر غور و فکر کرنے کی دعوت دی۔ میرے خیال میں انسان کی فکری آزادی اس سے زیادہ اور کیا ہوسکتی ہے کہ رسول اللہ صلعم کو صحابۂ کرام سے مشورہ لینے کا حکم دیا۔ بعض حالات میں آپ نے صحابہ کی رائے کو ترجیح دی۔ مثلاً جنگِ اُحد میں آپ کا یہ خیال تھا کہ مدینے میں محصور ہو کر دشمنوں سے مقابلہ کیا جائے اور صحابۂ کرام کی یہ رائے تھی کہ باہر نکل کر آگے ہی اُن کا راستہ روکا جائے۔ آپ نے یہی رائے پسند فرمائی۔

بدر میں اگرچہ صحابہ نے نادم ہوکر اپنی رائے واپس لینے کا مشورہ دیا۔ کیونکہ رسولؐ کی رائے مغلوب ہو رہی تھی لیکن آپ نے پسند نہیں فرمایا کیونکہ آپ کو فکری آزادی کی تعلیم دینی مقصود تھی اور استبداد سے روکنا چاہتے تھے، اس صورت میں یہ مقصد فوت ہو جانے کا اندیشہ تھا اس لئے وہی اگلی رائے رہنے دی۔

عقائد کی آزادی سے متعلق قرآن نے یہ اعلان کیا: "لا اکراہ فی الدین" (اسلام میں جبر نہیں ہے) ہر شخص کو کامل آزادی ہے، یہی وجہ ہے کہ حقوق کے احترام میں اسلام کے نزدیک مسلم اور غیر مسلم سب برابر ہیں۔ عدالت کے سامنے ان دونوں میں کوئی امتیاز نہیں۔ جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے عمرو ابن العاصؓ گورنر مصر کے لڑکے سے ایک غریب مصری کو بدلہ لینے کی اجازت دی، جس کو اس لڑکے نے کچھ نقصان پہنچایا تھا۔ (۲) سے بڑھ کر حقوق کا احترام اور کیا ہو سکتا ہے۔

(۳) تیسرا حق طبعی یہ ہے کہ انسان اپنے عمل و فعل میں خود مختار اور آزاد ہو، زمین سے نفع حاصل کرنے میں کامل حق رکھتا ہو۔ اس اصول کے تحت اسلام نے نہایت شاندار کامیابی حاصل کی۔ ہر شخص کو صنعت اختیار کرنے کی کامل آزادی دی، جو جس قسم کی زراعت یا تجارت کرے کوئی روک ٹوک نہیں بشرطیکہ حد سے متجاوز نہ ہو یعنی ایسا نہ ہو کہ دوسرے کی زمین پر کوئی غلبہ حاصل کرے۔ انہیں اعمال کی ترقی کے لئے ہند کی، رومی، یونانی اور فارسی آثار کی تحقیق و تفتیش کی گئی اور اس سرعت کے ساتھ مسلمانوں نے ترقی کی تاکہ آج یہ چیز انسانی تاریخ میں خارق عادت سمجھی جاتی ہے۔

(۴) چوتھا حق طبعی یہ ہے کہ تمام انسان حقوق انسانی میں مساوی ہوں۔ امیر کو مامور پر، عالم کو جاہل پر، غنی کو فقیر پر کچھ بھی امتیاز حاصل نہ ہو، کیونکہ سب خلقت میں مساوی ہیں۔

اس حق میں بھی اسلامی شریعت منفرد ہے۔ کیونکہ اسلام نے جیسی مساوات دنیا کے سامنے پیش کی وہ نہ تو کسی شریعت میں ہے اور نہ آئندہ ہونے کی امید۔ چنانچہ قرآن نے اعلان کیا کہ تمام انسان خلقت اور حقوق میں مساوی ہیں: "یا ایھا الناس انا خلقنکم من ذکر و انثی" (اے لوگو ہم نے تم کو مذکر و مونث پیدا کیا) اس آیت شریفہ میں خلقی مساوات دکھائی، حقوق کے متعلق فرمایا: "انما المؤمنون اخوۃ" (سب مسلمان بھائی ہیں)، جب سب مسلمان بھائی ہیں، پھر وجہ ترجیح کس طرح ہو سکتی ہے۔ حدیث میں وضاحت آچکی ہے کہ کسی عربی کو عجمی پر، یا غنی کو فقیر پر، یا عالم کو جاہل پر، یا سفید کو کالے پر، غرض کسی کو کسی پر امتیاز حاصل نہیں بلکہ تمام انسان عدل الٰہی کے سامنے مساوی ہیں۔ فضیلت صرف روحانی درجات میں ہے، جن کا اعتبار

اخروی دنیا کے لئے مخصوص ہے۔ اسی عدل اور مساوات کو رسول اللہ صلعم نے ان شاندار اور قابلِ عزت الفاظ میں ذکر فرمایا "واللہ لو سرقت فاطمۃ بنت محمد لقطعت یدھا" واللہ اگر محمد کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ قطع کر دیتا۔

یہی وہ حقوقِ طبعی ہیں جن سے تمام اصولِ ثانوی مشتق اور متفرع ہوتے ہیں۔ یہ حقوق اسلامی شریعت پر کامل طور سے منطبق ہوتے ہیں، جیسا کہ آپ کو معلوم ہوگیا۔ لہذا ثابت ہوا کہ اسلامی شریعت اکمل و افضل ہے، اس کے قانون میں تغیر و تبدل کی کچھ ضرورت نہیں۔ یہ کامل و محکم مطابقت شریعتِ اسلامی کے قانون (جسکو آج تیرہ سو سال سے زائد کا زمانہ گزرتا ہے) اور فلسفہ تشریع کے موجودہ مسلمات کے درمیان، اس بات کو ثابت کرتی ہے کہ یہ شریعت انسانی فکر کا نتیجہ نہیں، کیونکہ ارسطو جو متقدمین میں سب سے بڑی عقل رکھتا تھا، افلاطون، سولون، لیکورج اور قوموں کے تمام قانون ساز سب مل کر بھی کوئی ایسی شریعت نہ پیش کر سکے جو عدلِ طبعی اور حقوقِ طبعی کے مطابق ہوتی۔ حالانکہ ان لوگوں نے اپنی تمام عمریں اس کی تحقیق میں صرف کر دیں۔ تمام ملک فلسفہ دانوں سے بھرا ہوا تھا اور بڑے بڑے قانون ساز موجود تھے لیکن کچھ نہ ہو سکا، پھر کیا ہماری عقلیں یہ تسلیم کر سکتی ہیں کہ ایک عربی جو علم سے محروم تھا، اس کے ملک میں نہ قاضی تھا نہ حکومت، نہ کوئی دستور اور نہ نظام۔ وہ ایسا قانون تیار کر سکتا ہے جو عدلِ مطلق کے اعلیٰ درجے پر منطبق ہو اور فلسفۂ تشریع کے نہایت ٹھوس اور مستحکم اصول کے مطابق ہو میرے خیال میں کوئی عقل تسلیم نہیں کر سکتی۔ تو پھر ثابت ہو گیا کہ رسول اللہ صلعم کے پاس خاص طور سے وحی آئی اور یہ قانون خدا کا بنایا ہوا قانون ہے جیسا کہ قرآن نے فرمایا ہے "ولو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافا کثیرا"

خواجہ حمید اور اُن کی شاعری

مولانا ابو داؤد لکھنوی

اس بھول جانے اور بھلا دینے والی دنیا میں ابھی ایسی ہستیاں ہندوستان کے مختلف گوشوں میں موجود ہیں جو قاآنیِ ہند خواجہ عزیز الدین عزیز لکھنوی مرحوم سے محض واقف ہی نہیں بلکہ ان کے شرفِ تلمذ سے بھی سرفراز ہیں اور ایسے بزرگ تو بہت ہیں جنہوں نے خواجہ صاحب اور اُن کی بزمِ ادب کے جلوے اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔ خواجہ صاحب اپنے وقت میں فارسی زبان کے بے مثل شاعر اور باکمال انشا پرداز تھے، اس کا اعتراف تمام ہم عصر اربابِ فضل و کمال نے کیا ہے۔

۱۹۱۵ء میں خواجہ صاحب نے بعمر ۸۵ سال وفات پائی۔ خواجہ جلیل الدین، ڈاکٹر خواجہ رشید الدین، حافظ خواجہ امین الدین، خواجہ وصی الدین ڈپٹی کلکٹر لکھنؤ، چار صاحبزادے چھوڑے، ان چاروں میں سے کسی کو سخن سنجی کا ذوق نہ ہوا۔ خواجہ وصی الدین صاحب کے متعلق تو مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے یہاں تک فرما دیا ہے:

"خواجہ عزیز کے فرزند عزیز خواجہ وصی الدین صاحب میں اور بہت سے جوہر ہیں مگر "موزونیت" تو ان کی طبیعت سے برا مثل دور رہے"! (مقدمہ کلیاتِ عزیز)

ڈاکٹر خواجہ رشید الدین مرحوم کے دو صاحبزادوں میں سے ایک خواجہ حمید الدین کو دادا کی میراثِ شعر و سخن ملی ہے اور اوصاف و اخلاقِ عزیزیہ سے بھی بہرۂ وافر حاصل ہوا ہے۔ دادا کی سی سیر چشمی، خودداری، احباب نوازی، وضعداری، انکسار، قناعت و استغنا کے کرشمے پوتے کی ذاتِ ستودہ صفات میں کار فرما نظر آتے ہیں۔

خواجہ حمید کے نانا خواجہ بہار الدین مرحوم بھی ایک خوش فکر شاعر تھے۔ نمونۂ کلام:

صبح در غم گذرد شام بہ ماتم گذرد — ایں چنیں صبح و چنیں شام بہ کس کم گذرد

تن بہ تقدیر نہادیم و بہ تسلیم و رضا — ہر چہ آید ابشل، بر سر آدم گذرد

خلشِ کاوشِ پیکاں چہ تواں گفت بہا — تیرِ مژگاں بہ دلِ خستہ چو پیہم گذرد

اِن کی اولاد میں بھی کوئی شاعر نہ پیدا ہوا، نانا کا ورثۂ شعری بھی حمید ہی کے حصے میں آیا، اسی کا اظہار اس طرح کرتے ہیں ؎

اسی کی ذات سے اب ہے عروجِ بزمِ ادب — سخنوران سلف کی ہے یادگار حمید

لکھنؤ کے مشہور طبیب حاذق، حکیم خواجہ کمال الدین صاحب مرحوم حمید کے سگے ماموں تھے، اور سگے پھوپھا بھی۔ اسی خاندانی یگانگی کی وجہ سے خواجہ حمید ماموں ہی کے گھر میں رہے، یہیں عہدِ طفلی بسر ہوا، یہیں جوان ہوئے، یہیں اب تک ہیں اور یہیں رہیں گے۔ شفیق ماموں نے باپ کی طرح پالا، ممانی نے مادرانہ شفقت سے آغوشِ تربیت میں رکھا، حکیم صاحب مرحوم نے پہلے گھر پر آبائی رسم ورواج کے مطابق فارسی تعلیم دلائی، پھر حسین آباد ہائی اسکول میں داخل کر دیا، وہاں انٹرنس تک تعلیم حاصل کی، اس کے بعد کا حال نہیں معلوم ہو سکا کہ کس کالج میں کہاں تک پڑھا؟ مگر یہ تحقیق معلوم ہے کہ اپنے باکمال دادا خواجہ عزیز الدین مرحوم سے تبرکاً بھی کچھ نہ پڑھ سکے، حالانکہ فضلائے عالم کے لوگوں نے خواجہ عزیز سے فیض تعلیم لیا، اور مشاہیرِ وقت نے دامنِ تلمذ سے وابستہ ہونے کو فخر و عزت سمجھا۔ خواجہ حمید ننہیال میں ایسے رہے کہ ددھیال تقریباً چھوٹ گیا۔

خواجہ حمید کے گھرانے میں تو فارسی کا چلن تھا، دادا، نانا نے جو کچھ کہا فارسی میں کہا، ان کے وقتوں میں بھی لکھنؤ اردو شاعری کا جولانگاہ بنا ہوا تھا، اربابِ کمال اردو میں دادِ سخن دے رہے تھے، مگر خواجگانِ کشمیر نے اس کی طرف اعتنا نہ کی۔ حمید میں جذبۂ شعری جب اُبھرا اس وقت اردو اور زیادہ ہمہ گیر ہو چکی تھی، اسی نسبت سے فارسی کا بازار سرد ہو چکا تھا، اس لئے موصوف نے اردو ہی کو طبع آزمائی کے لئے منتخب کیا اور خواجہ عزیز کے شاگرد، اپنے عزیز محترم خواجہ عشرت لکھنوی مرحوم کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنا پسند فرمایا۔ خواجہ عشرت اردو شاعری میں شیخ محمد جان شاد لکھنوی کے شاگرد تھے، شاد کو میر کلّو عرش بن میر تقی میر سے شرفِ تلمذ تھا، اس نسبت نے خواجہ حمید کو صرف تین بزرگوں کے واسطے سے میر تقی میر تک پہنچا دیا، اپنے اس سلسلے پر انھیں ناز ہے اور بجا ناز ؎

سوزشِ دل سے بیاں میں ہوئی تاثیر حمید — فیضِ عشرت سے ملا میر کا انداز مجھے

خاندانِ میر سے وابستگی نے اس فکر کو خوب دلنشیں کر دیا کہ ؎

درد و تاثیر سے خالی جو ہوئی نظم حمید — کیا کرے گا کوئی دیوان تمہارا لے کر

کس طرح بے اثر مرے اشعار ہوں حمید — کہتا ہوں وہ گذرتی ہے جو قلب زار پر

حمید اظہار درد دل ہے ورنہ — غزل کا اور کچھ مطلب نہیں ہے

اپنے استاد پر بھی فخر کرتے ہیں، جو آج کل نوجوان شعرا کے طبقے میں فرسودہ اور مہمل سی بات ہے۔

پیروی طرز عشرت چاہئے تجھکو حمید — رنگ پیدا ہو نہ سے اشعار میں استاد کا

ہے وہی رنگ سخن اپنے بھی دیواں میں حمید — کون کہتا ہے کہ ہم پیرو استاد نہیں

خواجہ عشرت مرحوم فارسی ادب میں بہت اچھی دستگاہ رکھتے تھے، خواجہ عزیز کی شاگردی جس کی ضامن و شاہد ہے۔ عربی سے غالباً کم بہرہ ور تھے۔ اردو ادب میں صاحب تحقیق محاورات زبان، قواعد صرف و نحو، تذکیر و تانیث اور متروکات وغیرہ تمام مسائل پر بڑا عبور تھا۔ لکھنوی زبان کے ترجمان تھے۔

دلی کی طرح لکھنؤ کی زبان بھی ٹکسالی تسلیم کر لی گئی ہے۔ یہاں کی بول چال اور محاورے مستند مان لیے گئے ہیں، شعرائے لکھنؤ کا کلام سند میں پیش کیا جاتا ہے۔ بایں ہمہ اب تک لکھنؤ کی سرزمین چند گنتی کے نثر نگار پیدا کر سکی ہے انھیں چند میں خواجہ عشرت مرحوم بھی ایک ہیں۔ عام طور سے خواجہ عشرت کی نظمیات سے تو دنیا کی آنکھیں کم روشن ہوئی ہیں، البتہ ان کی سلجھی ہوئی سلیس، سادہ نثر کے نمونے بکثرت منظر عام پر آکر اہل قلم حضرات سے داد لے چکے ہیں۔ تاریخ اودھ پر مرحوم نے بہت سے مضامین لکھے اور ملک کے وقیع رسائل نے شائع کئے ہیں۔ اگر ان مضامین کا مجموعہ مرتب کر کے شائع کر دیا جائے تو ایک طرف تو معلومات کا ایک اچھا ذخیرہ فراہم ہو جائے گا دوسری طرف ادب و انشا کا قابل قدر مواد انتشار و اتلاف سے بچ جائے گا۔ لیکن ؎

آج یہ کار خیر کون کرے؟

طالبان فن شعر کے لئے مرحوم نے متعدد، کارآمد چھوٹی چھوٹی کتابیں لکھیں، اپنے ہی اہتمام و خرچ سے چھپوا کر شائع کیں، ان میں سے بیشتر کافی مقبول ہوئیں اور بار بار چھپتی اور ہاتھوں ہاتھ بکتی رہیں۔ ہندو شعرا کا ایک تذکرہ لکھا ایک اردو لغت خاص زاویہ نظر سے لکھ رہے تھے، افسوس کہ اس کے اختتام سے پہلے زندگی ختم ہو گئی۔ سنا ہے کہ تمام مسودات بھی تلف ہو گئے۔

بہت سادہ مزاج، متواضع، قناعت پسند، مرنجان مرنج، ہر شخص کو راضی رکھنے والے بزرگ تھے۔

گروہ بندی سے نفور، پارٹی فیلنگ سے دور، ہر مشرب والے سے میل ملت، ہر مذہب والے سے تعلقات، نہ کسی فکر و نظر والے سے مخالفت، نہ کسی تنگ نظر یا وسیع الخیال سے کد و کاوش۔ ایک کتابوں کی دُکان تھی، وہی ذریعۂ معاش اور بسر گزار۔ باب علم و ادب بھی۔ ہر روز سہ پہر کو مشاہیر وقت کا اس پر جمگھٹا رہتا تھا، بات پر بات چھڑتی تھی، نکات سے نکات نکلتے تھے، ہم ایسے مبتدیوں کے لئے یہ گفتگوئیں اور بحثیں بہت مفید و کارآمد ہوتی تھیں۔ غرضکہ خواجہ صاحب کی دُکان شعر و شاعری کا ایک کلب یا اسکول تھی، اور خواجہ صاحب کی ذات کیا تھی، جامع ارباب صفات تھی۔ خواجہ حمید نے استاد کا جو انتخاب کیا اس کے سنجیدہ و برگزیدہ ہونے میں کیا کلام! رشتۂ قرابت پہلے ہی سے استاد شاگرد دونوں کو جوڑے ہوئے تھا۔ اب اس نسبت نے اور سونے میں سہاگے کا کام کیا۔

خواجہ حمید مذہبی خیالات میں بہت پختہ، راسخ العقیدہ مسلمان ہیں، مذہبی تحریکات میں حسب موقع مناسب ذمت حصہ لیتے رہتے ہیں۔ انگریزی تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود کبھی انگریزی ملازمت نہ کی۔ اگرچہ تقاضائے حال یہی تھا اور مواقع بھی موجود تھے۔ البتہ اپنے ماموں حکیم کمال الدین صاحب کے اصرار سے میونسپل کمشنری کے لئے کھڑے ہوئے اور ذاتی وجاہت و قابلیت کی بنا پر الکشن میں کامیاب ہوئے۔ تین برس تک انہماک اور تندہی سے کام کرتے رہے۔ دوبارہ پھر کھڑے ہوئے اور کامیاب ہوئے۔ چھ برس کے بعد ۱۹۳۶ء کے الکشن میں الگ رہے، اپنے ذاتی مشاغل کی وجہ سے چھ سال کی ساتھی میونسپلٹی کو الفراق کہا۔ وارڈ کے تمام لوگ مطمئن اور اخلاق کے معترف ہیں۔ ہمارے خواجہ کو کام ہی سے کام رہا نام پر کبھی نظر نہ گئی۔ پبلک کے اصرار کے باوجود اُدھر کا رُخ نہ کیا، گوشۂ عافیت کو ترجیح دی اور شہرت پسندی کے اس دور میں عزلت گزینی پسند کی ؎

کوچۂ فقر میں راحت پاکر　　ہم لگا بیٹھے ہیں بستر اپنا　　(حمید)

حمید میں اپنے بزرگوں کے بہت سے اوصاف حمیدہ جمع ہیں اور ان کی شاعری میں اکثر وہ اوصاف جھلکتے رہتے ہیں مثلاً

بار احسان اٹھانے سے گریز

یہ گردن اور جھک جائے کسی کے بار احسان سے　　مری عزت کو ہرگز یہ گوارا ہو نہیں سکتا

آہ کو ناگوار تھا احساں　　کبھی منت کش اثر نہ ہوئی

خدمتِ خلق اور احسان کر کے بھول جانا

یاد رکھ راستیِ عقل کا فتویٰ ہے یہی　　بھول جانا جو کسی پر کوئی احساں کرنا

خلق کی خدمت میں ہر راحت کو قرباں کیجئے　　اک یہی نقصاں ہے جس پر شکرِ نقصاں کیجئے

قناعت و استغنا

کیا کم ہے یہ خزانہ کہ دل ہے مرا غنی　　کیوں آرزوئے دولتِ دنیا گدا کرے

شہرت پر استعجاب

مجھ سے کہیں آگے مری شہرت کا قدم ہے　　میں گھر میں ہوں اور شہر میں افسانہ ہے میرا

احباب نوازی

مایۂ ناز نہیں اپنی وفائیں ہم کو　　فرض کچھ تیری محبت کا ادا کرتے ہیں

وضعداری

تم اپنی وضع پہ قائم ہو کیوں خدا جانے　　بدلتی جاتی ہے تاریخ تو زمانے کی

چاہے خدا پرست ہے یا وہ صنم پرست　　پابند ہے حمید مگر رسم و راہ کا

خودداری

بات رکھنے کے لئے جان فدا کرتے ہیں　　ہم انھیں میں سے ہیں جو اپنا کہا کرتے ہیں

ملال اور ہوا عرضِ حال کر کے مجھے　　ملا جواب نہ اُن سے سوال کر کے مجھے

راقم الحروف پر خاص نظرِ عنایت ہے، عمر میں قدرے چھوٹے مرتبہ میں بہت بڑے ہیں، عمر کی چالیس پینتالیس منزلیں طے کر چکے ہیں۔ بوٹا سا قد، گورے چٹے، دبلے پتلے، متناسب الاعضاء، کشادہ پیشانی، چہرہ پر صباحت، آنکھوں میں ملاحت، سر سے پا تک سنجیدگی و متانت، جس وقت سر پہ ترکی ٹوپی اور بر میں سیاہ شیروانی ہوتی ہے تو ؎

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

خواجگانِ کشمیر کو کشمیر زمیں گندریں، لکھنؤ میں سکونت پذیر ہوئے پشتیں بیتیں مگر اس جنت نظیر کی وطنیت دل و دماغ پر بدستور مستولی ہے۔ جب کشمیر کی یاد آتی ہے اپنے کو غریب الوطن تصوّر کرنے لگتے ہیں۔ یہی حال خواجہ حمید کا بھی ہے ؎

کشمیر و لکھنؤ میں ہے کوسوں کا فاصلہ   لائی کہاں سے گردشِ تقدیر دیکھنا

اک بےکلی ہے دوسری یادِ وطن حمید   ہمدرد اب یہی ہیں غریب الدّیار کے

تجھ کو حق رکھے سلامت تیرے دم سے اے حمید   لکھنؤ میں ہے مذاقِ شاعری کشمیر کا

جب لکھنؤ کا غلبہ ہوتا ہے تو ایسا فرمانے لگتے ہیں ؎

جنت کی بھی ہوس نہ رہی مجھ کو اے حمید   دل جب سے لگ گیا ہے اس اُجڑے دیار میں

کشمیر کی آبائی وطنیت اور زاد بوم لکھنؤ کی کشش جب باہم سموجاتی ہیں تو یہ نغمہ فضا میں گونجنے لگتا ہے ؎

ساکنانِ لکھنؤ میں کیوں نہ ہو اپنا شمار   ہم سخن کی داد لینے آئے ہیں کشمیر سے

خواجہ حمید کا ذوقِ سخن فطری ہے یا یوں کہہ لو کہ "جدّی" ہے۔ فکرِ سخن کا شوق کب سے ہوا، اس کا سُراغ نہ لگ سکا۔ غالباً فراغتِ تعلیم کے بعد اس میں باقاعدگی پیدا ہوئی۔ طبعی عزلت پسندی اور مشاعروں میں عام ہڑبونگ کی وجہ سے کبھی شرکت نہیں کی۔ اس لئے لکھنوی شعرا رعام طور سے حمید کی سخن سنجی سے ناواقف ہیں۔ البتہ مخصوص احباب کی صحبت میں طبیعت آئی تو دادِ سخن دے لی ورنہ وہی گوشہ نشینی اور سیرِ عالمِ تنہائی ؎

ہوتے رہتے ہیں شب و روز تماشے کیا کیا   نام دنیا ہے مرے عالمِ تنہائی کا

جلوہ کو دل سے رہا ہیشِ نظر جلوۂ دوست   میں پریشان نہ ہوا عالمِ تنہائی سے

نام و نمود سے مبالغے کی حد تک گریز ہے۔ جب کلام کا معتد بہ حصّہ جمع ہو گیا تو نیازمندوں نے اشاعت کے لئے عرض و معروض کی کچھ اعتنا نہ ہوئی، پھر اصرار ہوا اور اصرار نے شدّت اختیار کی تو خاطرِ احباب سے مجبور ہو کر آمادہ ہوئے ؎

خاطرِ دوست ہے منظور نہیں دل شکنی   چند اوراقِ پریشاں ہیں یہ دیوان نہیں

غزلیں ردیف وار مرتب ہوئیں، "پروازِ خیال" نام رکھا گیا، ناظرینِ کرام کی خدمت میں التجا کی گئی ؎

ہوں چشم پوش عیب سے میرے کلام کے ۔۔۔ تحسین کی حمید ضرورت نہیں مجھے

نامی پریس لکھنؤ کو مسودۂ دیوان کتابت و طباعت کے لئے سپرد ہوا، پریس نے اہتمام کا حق ادا کیا، مارچ ۱۹۲۱ء میں خوبصورت چھوٹی تقطیع پر دو رنگوں میں چھپکر اور خوشنما جلدوں میں مجلد ہو کر منظرِ عام پر آیا۔ اربابِ ذوق کے لئے "سرمۂ معرفتِ نظر" بنا۔ نیازمندوں کی "چشمِ خریدار" پر بارِ احسان ڈالا گیا، مگر اپنی ادا کے ساتھ

بھول جانا جو کسی پر کوئی احسان کرنا

فروخت کے لئے نولکشور پریس سے معاملت کرلی گئی ہے۔ سات مہینے میں پورا ایڈیشن پریس سے نکل کے خریداروں کے ہاتھ میں پہنچ گیا۔ اس وقت ہمارے نوجوان شاعر کی عمر تیس سال کے اندر ہی تھی، اور "چہل سال عمرِ عزیزت گذشت" کے بزرگانہ طعنے سے باہر۔ عمر پر نظر کرتے ہوئے خیال ہوتا ہے کہ مشقِ سخن بھی ابھی نوجوانی کی انگڑائیوں میں ہوگی۔ تاہم "پروازِ خیال" میں پختہ مشقی کی کافی بہاریں موجود ہیں ؎

کیا کیا نہ قیامت کی اک خون کے قطرے نے ۔۔۔ بنتا نہ اگر یہ دل کیا جانئے کیا ہوتا

میں نہ مانوں گا اثر ہے میری ہی فریاد کا ۔۔۔ خاک ہوتا فصلِ گل میں خانۂ صیاد کا

لطفِ الفت کے ملے رنجِ عداوت کے سبب ۔۔۔ ہم نے ہر رنگ نہ ماننے کی ہوا کا دیکھا

اب جو دنیا سے نہ کچھ لے کے چلے غم کیوں ہے ۔۔۔ یہ تو سوچو کہ تم آئے تھے یہاں کیا لے کر

گلشنِ ہستی میں ہم ڈھونڈا کئے آرام کو ۔۔۔ کیا ترقی پر ترقی تھی خیالِ خام کو

مرنے والا حشر سے کیوں پہلے آنکھیں کھولتا ۔۔۔ ایسی راحت عمر بھر اُس نے کبھی پائی نہ تھی

ہم کو نہیں منظور کہ ہو درد کو آرام ۔۔۔ تکلیف سے ہر وقت تری یاد رہیگی

لطف ہے انتظار میں لیکن   دل کو امیدوار کون کرے

پروازِ خیال کی اشاعت کے بعد پانچ چھ سال کی مدت میں پھر تقریباً آٹھ نو سو شعروں پر مشتمل کلام جمع ہو گیا۔ استادِ محترم کی رائے ہوئی کہ صرف سو شعروں کا انتخاب شائع کیا جائے۔ اطاعت گزار شاگرد نے اس رائے پر عمل پیرا ہونا سعادتمندی سمجھا، حالانکہ شاعر اپنے ہر قسم کے تمام کلام کو ایسا ہی عمدہ اور حسین سمجھتا ہے، جیسا کہ "ہمہ کس را عقل خود بکمال نماید و فرزند خود بجمال"۔ انتخاب کا مسئلہ سعادت مندی کی فضا میں اتفاقِ رائے سے طے ہو جانے کے بعد یہ سوال پیدا ہوا کہ "یہ کرے کون ؟" خواجہ عشرت کی نظر مرزا ثاقب قزلباش لکھنوی پر گئی۔ حمید نے مرزا موصوف کی خدمت میں حاضری دی اور عرضِ مدعا کی۔ مرزا ثاقب نے کلامِ حمید کو درخورِ اعتنا سمجھا، ذمہ داری لے لی اور انتخاب شائع فرما دیا۔ یہ گلِ صد برگ ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا۔

مرزا ثاقب خواجہ عشرت کے ہم عمر و ہم چشم تھے، مگر خواجہ حمید کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ نظر حمید کی عمر و مرتبہ پر نہ تھی بلکہ شعور شعر اور اوصافِ حمیدہ پر تھی۔ ورنہ مرزا صاحب اچھے اچھوں کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ مرزا و حمید میں باہم ربط و ضبط جب زیادہ بڑھا تو حمید نے جرأت کر کے عرض کی "یہ آرزو ہے کہ کلامِ ثاقب کا انتخاب کروں اگرچہ چھوٹا منہ اور بڑی بات ہے"۔ مرزا نے خوش ہو کر کہا "بسم اللہ، شوق سے، میرے لئے باعثِ مسرت ہے"۔ یہ عرضِ نیاز قبول تو ہو گئی مگر ۱۹۳۶ء کے بعد اگرچہ میونسپلٹی کو خیر باد کہا جا چکا تھا، حالات نے ایسا پلٹا کھایا اور حوادث نے اس طرح گھیرا کہ خواجہ حمید دل گرفتہ ہو گئے ؎

مٹا رہا ہے مجھے آسماں حسد سے کیوں   وحیدِ عصر نہیں فخرِ روزگار نہیں

مزاج نازک، طبیعت حساس، دنیا کی بے مہری و بے وفائی، خود غرضی و حق ناشناسی نے وہ ستم توڑے کہ دل ٹوٹ گیا، زندگی بجھ گئی، افسردگی چھا گئی، ہر چیز سے منہ موڑ لیا، محبوبہ شاعری تک سے بات کرنا چھوڑ دیا۔

کیوں وقت گنواتے ہو غزل گوئی میں اپنا   کیا تم کو حمید اور کوئی کام نہیں ہے

فکرِ دنیا حمید ہے دن رات   شعر کیا اور شاعری کیسی

کتابیں جو بڑے ذوق شوق سے جمع کی تھیں کچھ دوستوں کو بانٹ دیں، کچھ داشت پرداخت نہ ہونے کی وجہ سے تلف ہو گئیں، جو کچھ بچ رہیں ان میں مرزا ثاقب کا کلیات بھی تھا۔ اس پر جب نظر پڑتی تھی وعدۂ انتخاب کی یاد دلاتی تھی، آخر کار پنسل دست بوس ہوئی اور اشعارِ ثاقب پر نشان لگنے لگے، پھر قلم گرفت میں آیا

اور سیلِ نہار کی چند گردشوں میں صفحۂ قرطاس پرستاروں کا ایک جھرمٹ نظر آنے لگا۔

انتخاب کے سحر انگیز عمل سے طبیعت میں ایک گرمی اور گرمی میں ایک نواسنجی پیدا ہوئی۔ اس عمل اور اثرِ عمل نے متعدد غزلوں کی نقش بندی کر دی۔ ان تازہ غزلوں کا انتخاب ہوا "گلِ صد برگ" پر نظرِ ثانی کر کے دونوں کو ضم کر دیا گیا۔

انتخابِ ثاقب اور انتخابِ حمید کے دونوں مجموعے مرزا ثاقب کی خدمت میں ترمیم و توثیق کے لئے پیش کر دئے گئے مرزا صاحب نے ملاحظہ فرما لئے، ابھی کچھ ہاتھ نہ لگانے پائے تھے کہ اجل نے اپنا ہاتھ دراز کر دیا اور ۲۴ نومبر ۱۹۴۶ء کو جانِ ضمیر اسی کے نذر ہوگئی۔ اب یہ دونوں انتخاب ایک ساتھ "درنشا طِ خاطر" کے نام سے چھپنے کے لئے نامی پریس لکھنؤ کو دے دئے گئے ہیں۔ امید ہے کہ جلد زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر نگاہِ شوق کو پیراستہ کریں گے۔ انتخابِ حمید کے چند اشعار ملاحظہ فرمائے جائیں:

محبت کی مجبوریاں اللہ اللہ — گوارا کیا ہم نے ہرنا گوارا

اُن سے بھی اب تو ملتے ہیں بیگانگی سے ہم — اس میں ہے ایک راز کہیں کیا کسی سے ہم

کیا سمجھ کر حسن کی بیداد کا شکوہ کیا — اے دلِ ناعاقبت اندیش تو نے کیا کیا

خدا جانے کیا ہے مری داستاں میں — بہت غور سے یہ سنی جا رہی ہے

بے قراروں کا خریدار ہے کون — کس کو دیدوں دلِ مضطر اپنا

ایک تصویر ترے حسن کی ہے — ہم نے دیکھا ہے مقدر اپنا

واقف ہے حاجتوں سے وہ حاجت روا حمید — کیا فائدہ جو فکر کریں عرضِ حال کی

دیکھ کر حدِ تحمل سے گزرنا غم کا — دلِ حسرت زدہ کو زیست کا ارماں نہ رہا

اے چشمِ جنوں تیری وسعت کو خدا رکھے — ہر ذرہ بیاباں کا صحرا نظر آتا ہے

مصیبت زدہ بن کے خوب آزمایا — کوئی دوست اس غم کدے میں نہ پایا

زہے قسمت ترے ظلم و جفا کی — مری فریاد پر رحمت خدا کی

کیوں ترس آئے کسی کو اس کے حالِ زار پر — جو نظر رکھتا نہیں اپنے مآلِ کار پر

توقع گر نہ تھی ہم کو اثر کی — تو پھر فریاد کس امید پر کی

بنے بیٹھے ہیں گردِ کارواں ہم — اٹھیں تو اڑ کے چھو لیں آسماں ہم

بے خبر دل کے سفینے سے ہیں ساحل والے — راہ کا حال نہیں جانتے منزل والے

محمود رآہی بی، اے۔

انتقام

سعید۔ دیکھو، خاموش رہو، جانتے ہو میرے ہاتھ میں کیا ہے، پستول، اگر ذرا بھی ہلنے کی کوشش کی، تو کہیں ایسا نہ ہو کہ میری انگلی سے لبلبی دب جائے۔

قاسم۔ (مستقل مزاجی سے مگر بوڑھا ہونے کی وجہ سے کانپتی ہوئی آواز میں) سعید اگر کچھ خوف خدا ہے تو یہ سب کچھ کیوں کر رہے ہو، میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔

سعید۔ ہاں اب تمہاری سمجھ میں کیوں آنے لگا، نہ تمہاری سمجھ میں پہلے کبھی آیا نہ اب آئے گا۔ تم میرے گھر کے خاندانی نوکر ہو قاسم، لیکن تم نے کبھی حقِ نمک ادا کرنے کی کوشش نہیں کی یا ضرورت نہ سمجھی۔

قاسم۔ (اسی لہجے میں) بیٹا یہ تم کیا کہہ رہے ہو، میں کیا اسی دن کے لئے زندہ تھا، اسی دن کے لئے تمہاری آس لگائے . . . . .

سعید۔ بس، بس، آواز تیز نہ ہونے پائے، اس رات کی گھناؤنی تاریکی میں اب میں وہ سب کچھ کرنا چاہتا ہوں جو پہلے بہت آسانی سے کر سکتا تھا، اور دیکھو قاسم تمہیں میرا ساتھ دینا ہوگا۔

قاسم۔ (گھبرا کر) سرکار. . . . . کیا ارادہ ہے آپ کا۔ سنئے کسی کے آنے کی آواز آرہی ہے. . . . . بڑے سرکار ہیں شاید. . . . . . سرکار آ. . . . . . آپ. . . . . .آپ سرکار ابھی چلے جائیے، نہیں تو کچھ نہ کچھ ضرور ہو جائے گا. . . . . .میرے سرکار میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں آپ کا سب کام ٹھیک کر دونگا۔

سعید۔ نہیں قاسم یہ ہرگز نہ ہوگا، میں نے انتقام لینے کا پختہ ارادہ کر لیا ہے اور جو کچھ ارادہ کیا ہے، اُسے کر ہی کے جاؤں گا، لیکن دیکھو اگر تم نے میرے خلاف ذرا بھی کچھ کہا یا کیا تو ٹھیک نہیں. . . . .

(دروازے پر کسی کی دستک سنائی دیتی ہے اور پھر آواز آتی ہے۔ کمرے میں بالکل خاموشی ہے کوئی دروازے پر قاسم کو دو تین بار پکارتا ہے۔ تھوڑی دیر خاموشی)

قاسم۔ (سرگوشی کے انداز میں) سرکار یہاں چھپ جائیے (پھر آگے تین چار قدم بڑھکر دروازہ کھولتا ہے

ہیں........سرکار اتنی رات گئے آپ یہاں، اور یہ آپ گھبرائے ہوئے سے کیوں ہیں ؟

رشید۔ (گھبرائی ہوئی آواز میں) کیا تمہارے کمرے میں کوئی ہے، کس سے باتیں کر رہے تھے ؟

قاسم۔ (کانپتی آواز میں) کوئی نہیں سرکار، آپ کہئے کیا بات ہے ؟

رشید۔ کیا کسی سے باتیں کر رہے تھے ؟

قاسم۔ نہیں سرکار خود ہی بڑبڑا رہا تھا۔ کہئے خیریت تو ہے، مگر یہ آپ کا چہرہ اترا ہوا کیوں ہے ؟

رشید۔ ذرا ادھر تو آؤ، دیکھو بیگم کو کیا ہو گیا ؟

قاسم۔ چلئے سرکار، خدا خیر کرے، آج کی رات کیا ہونے والا ہے، اے خدا تو رحم کر، اتنی تاریک اور ڈراؤنی رات تو میں نے کبھی نہیں دیکھی۔

(دروازہ بند ہونے کی آواز، خاموشی۔ رشید اور قاسم جاتے ہیں۔ قدموں کی چاپ دور ہوتے ہوتے گم ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ پھر خاموشی چھا جاتی ہے)

قاسم۔ بیگم صاحبہ، بیگم صاحبہ، ذرا دروازہ کھولئے، یہ آپ نے بند کیوں کر لیا ؟

رشید۔ میں تو کھلا چھوڑ کر تمہارے پاس گیا تھا۔

(اندر سے کسی کے آہستہ آہستہ آنے کی آہٹ سنائی دیتی ہے اور آواز کے ساتھ جھانجھوں کی بھی ہلکی ہلکی آواز سننے میں آتی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ چلنے والی عورت ہے، آہستہ سے دروازہ کھلتا ہے)۔

قاسم۔ بیٹا، یہ تمہاری آنکھوں میں آنسو کیسے، وہ بھی اتنی رات بیتے، یا خدا۔ آخر یہ ماجرا کیا ہے !

رشید۔ میں بھی پوچھتے پوچھتے تھک گیا۔ (تینوں کمرے میں داخل ہو کر دروازہ بند کر لیتے ہیں (بجلی چمکنے اور بادل گرجنے کی آواز)

قاسم۔ یا اللہ خیر کرنا !

رشید۔ بس یہ اسی طرح نو بجے سے صوفے پر بیٹھی ہیں، اور اب تو ڈھائی بجنے کو آئے، لیکن یہ ہیں کہ روئے جاتی ہیں، روئے جاتی ہیں اور بولتی کچھ نہیں۔

قاسم۔ میری سرکار۔ مجھے ضرور بتا دیں گی۔ سرکار آپ بھی کچھ نہ کچھ کہہ دیتے ہیں، یہ نہیں سوچتے کہ سننے والے کے دل پر کیا اثر ہوگا۔

رشید۔ ارے قاسم آج تو میں نے کچھ بھی نہیں کہا، بس کھانا کھا کر ہم دونوں ادھر آ گئے، یہ رسالہ اٹھا کر

صوفے پر بیٹھ گئیں، اور میں خط لکھنے میں مصروف ہوگیا کہ ان کی سسکیوں کی آواز آنے لگی ۔

(بیگم کے رونے کی آواز۔ ایک دو سسکیاں بھی)

قاسم ۔ بیگم صاحبہ! میں نے اس گھر کا نمک کھایا ہے (بھرائی ہوئی آواز میں) آپ سب کا خادم ہونے ہوئے بھی سب سے بڑا ہوں (سمجھا کر) میری اچھی بیگم صاحبہ، مجھے بتائیے تو کیا بات ہے؟

بیگم ۔ (روتے ہوئے) قاسم ..... قاسم (رونے لگتی ہے)

قاسم ۔ ہاں بیگم صاحبہ ہاں، کہئے تو آخر یہ آپ نے حالت کیا بنا رکھی ہے؟

بیگم ۔ قاسم میں تباہ ہوگئی ۔ میں کہیں ... کی نہ رہی ۔ (روتی ہے)

رشید ۔ ہیں! ہیں بیگم یہ کیا کہہ رہی ہو، آخر تمھیں یہ ہو کیا گیا ہے کچھ تو کہو ۔

قاسم ۔ مجھے اپنا بڑا سمجھو، میں انشاء اللہ تمھاری ہر تکلیف دور کرنے کی کوشش کرونگا ۔

بیگم ۔ بابا مجھے بچاؤ ۔ مجھے بچا......ؤ!

قاسم ۔ بیٹی تمھارا کوئی کچھ نہیں کرسکتا ۔ تم بے فکر رہو ۔ لو یہ پانی، منھ، ہاتھ دھولو ۔
(گلاس میں پانی ڈالنے کی آواز) لو بیٹا منھ دھولو ۔ یہاں کس قدر گرمی ہے، آؤ باہر آؤ، دیکھو کیسی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے، میرے کمرے میں بہت اچھی ہوا آتی ہے آؤ، آؤ، اُٹھو ۔

رشید ۔ ہاں، ہاں بیگم ۔ آؤ ذرا باہر ٹہل لو طبیعت ہلکی ہوجائے گی ۔ قاسم! رات بہت اندھیری ہے ۔ تم انھیں باغ میں تو نہیں، اپنے کمرے میں لے جاؤ ۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنا ۔ کچھ دل بہل جائے گا، میں بھی ابھی آتا ہوں ۔

قاسم ۔ اُٹھو بیٹی آؤ، باہر کتنی اچھی ہوا چل رہی ہے، گرمی میں تو اور طبیعت گھبراتی ہوگی ۔

(بیگم کے جانے کی آواز، ساتھ ہی قاسم بھی جاتا ہے لیکن رشید اُسے بلاتا ہے) ۔

رشید ۔ قاسم؟ قاسم!!

قاسم ۔ جی سرکار!

رشید ۔ ذرا سنو تو (قاسم واپس آتا ہے ۔ دھیمی آواز سے) قاسم ذرا معلوم تو کرنا کہ ایسی کیا بات ہوگئی ہے، جو بیگم اس قدر رو رہی ہیں کہ خدا کی پناہ ۔

قاسم ۔ سرکار آپ بے فکر رہئے ابھی سب کچھ معلوم ہوجائے گا ۔

(قاسم باہر جاتا ہے اور دروازہ بند کرنے کی آہستہ سے آواز سنائی دیتی ہے، پھر بیگم اور وہ ساتھ جاتے ہیں ۔ قاسم کمرے کا دروازہ کھولتا ہے لیکن وہیں کھڑے کھڑے کہتا ہے)

قاسم ۔ بیگم آپ ...... آپ ...... آ...... پ ۔

بیگم ۔ (نحیف آواز میں) رک کیوں گئے چلو اندر چلو ۔

قاسم ۔ (رکتے ہوئے) میرے کمرے میں اور آپ بیگم صاحبہ مگر...... بیگم

بیگم ۔ میں آج تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتی ہوں معلوم نہیں میرے بعد کیا ہو، کون کہاں رہے اور کدھر جائے ۔

قاسم ۔ لیکن بیگم...... م...... صا...... حب ۔

بیگم ۔ (جلدی سے) یہ لیکن ویکن کیا جلد اندر چلو، مجھے یہاں ڈر لگ رہا ہے، میں خود اندر چلی جاتی ہوں ۔

(دروازے پر ہاتھ مارتی ہے، چوڑیوں کی جھنکار سنائی دیتی ہے)

سعید ۔ آئیے آئیے نجمہ صاحبہ! آپ ہی کا انتظار تھا، آداب عرض ۔

نجمہ ۔ سعید! تم یہاں...... اتنی رات گئے ۔ کیسے......

سعید ۔ اوہو! تو آپ کو بھی میرا آنا ناگوار گزر رہا ہے ۔ لیکن اب مجھے تمہارے اچھے اور برے لگنے سے کیا مطلب ۔

نجمہ ۔ سعید ۔ سعید ۔ (ذرا زور سے)

سعید ۔ دیکھو، یہ میرے ہاتھ میں کیا ہے، ذرا آہستہ بولو تاکہ بیکار شور غل نہ ہو ۔

نجمہ ۔ (چونک کر) پستول، سعید یہ کیا ہوگیا ہے تمہیں، سال بھر بعد نظر آئے اور وہ بھی اس وحشت سے اس اندھیری اور بھیانک رات میں ۔

سعید ۔ بس خاموش، میرے پاس وقت کم ہے اور کام زیادہ......

قاسم ۔ بیٹا یہاں بیٹھو، چارپائی پر چادر بچھائے دیتا ہوں

سعید ۔ قاسم باہر گیلری میں پہلے ادھر اُدھر دیکھ لو، کوئی ہے تو نہیں ۔ پھر دروازہ اور اچھی طرح اندر سے بند کر لو تاکہ بھیا اگر اندر آنا بھی چاہیں تو نہ آسکیں ۔

قاسم :۔ بہت اچھا سرکار۔
نجمہ ۔ مگر سعید میں اس طرح تمہارے پاس نہیں بیٹھ سکتی، آخر یہ ماجرا کیا ہے۔
سعید۔ ماجرا۔ ابھی سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ اگر ذرا بھی حرکت کی تو پستول کی گولی تمہارے سینے کے پار ہو گی۔
نجمہ ۔ سعید......

(قاسم دروازہ بند کرتا ہے)

نجمہ ۔ آج مجھے تمہاری یاد بہت آرہی تھی اور دل اندر ہی اندر بیٹھا جارہا تھا۔
سعید۔ شٹ اپ ...... اب تمہارے منہ سے یہ جملے اچھے نہیں لگتے۔ تم میرے بھائی اور وہ بھی بڑے بھائی کی بیوی ہو ...... مگر نجمہ یہ تم نے کیا کیا ؟
نجمہ ۔ تم سمجھتے ہو کہ میں شادی سے انکار کر دیتی یعنی اپنے خاندان کے نام پر دھبہ لگا دیتی یا اپنے ماں باپ پر یہ بات ثابت کر دیتی کہ میں پڑھ لکھ کر آزاد خیال ہو گئی ہوں۔
سعید۔ ؟ نجمہ کیا تم سے اتنا بھی نہیں بنا ......؟
نجمہ ۔ یا دوسرے الفاظ میں یہ کہہ دیتی کہ......
سعید۔ لیکن تم اتنا تو کہہ دیتیں کہ میں رشید سے شادی نہیں کر سکتی۔
نجمہ ۔ اس لئے کہ سعید سے محبت کرتی ہوں، لیکن ......
سعید۔ اس میں لیکن ویکن کی کیا بات تھی۔
نجمہ ۔ یہ پستول جو آپ نے باہر نکال لیا ہے ذرا جیب میں رکھ لیجئے۔ سعید تم اتنے دن کہاں غائب تھے۔
سعید۔ بھیا نے میرے ساتھ جو کچھ کیا تم جانتی ہی ہو، پھر پوچھنے سے کیا فائدہ۔
نجمہ ۔ ہاں جانتی تو ہوں، مگر کیا تمہاری کوئی غلطی نہ تھی۔
سعید۔ (غصہ سے) نہیں نجمہ، نہیں۔
نجمہ ۔ کیا ایک شریف لڑکے کو یہ زیب دیتا ہے کہ وہ کسی طوائف سے تعلق رکھے۔
سعید۔ نجمہ، نجمہ، یہ کیا کہہ رہی ہو ؟
نجمہ ۔ اور پھر تم امتحان سے فارغ ہوتے ہی گھر کیوں نہ آگئے ؟
سعید۔ بھیا نے روپے، پیسے، مکان اور جائداد پر تو قبضہ کر رکھا تھا۔ ایسی صورت میں اگر میں گھر آتا تو وہ مجھے

نکال نہ دیتے۔

نجمہ ۔ محبت تو میں تم سے کرتی تھی نہ کہ تمہاری جائداد سے ۔ کم از کم میرے لئے ہی آجاتے ۔ پھر کرتے جو کچھ کرنا تھا لیکن یہ طوائف کا کیا قصہ ہے ؟

سعید ۔ طوائف ، کیسی طوائف ، کہاں کی طوائف ، کیسا تعلق اور کس کا تعلق ؟

نجمہ ۔ وہ محبوب جو ہے نا ، اُسی سے تو تمہارے تعلقات تھے ؟

سعید ۔ قطعی غلط ، بالکل جھوٹ ، یہ صرف بہانہ تھا ۔ آخر بھیا نے بتا ہی دیا کہ سوتیلے بھائی ایسے ہوتے ہیں ۔ اُنھوں نے مجھ سے جائداد ہی نہیں بلکہ سب کچھ چھین لیا ۔

نجمہ ۔ جب تمہارا ہی پتہ نہ تھا تو کوئی کیا کرتا ۔

سعید ۔ مگر تمھیں آخر یہ کیا سوجھا تھا کہ میرے ہی بھائی سے شادی کر ڈالی ۔

نجمہ ۔ مجھ سے بغیر پوچھے شادی کی گئی اور مجھے اُس وقت بتایا گیا جبکہ بھائی بھی گھر میں آچکے تھے ۔ ایسے وقت میں میں اپنی زبان کیسے ہلاتی ۔

سعید ۔ لیکن میں مر تو نہیں گیا تھا ؟

نجمہ ۔ ایسی زبان نہ نکالو ۔ (روتی آواز میں)

سعید ۔ تمہیں میری طرف سے کیا بالکل نا امیدی تھی ؟

نجمہ ۔ لیکن یہ معاملہ تم نے اپنے بھائی سے کیوں چھپائے رکھا ؟

سعید ۔ اور تم نے تو شاید اپنے والدین کو بتا ہی دیا ہوتا ؟

نجمہ ۔ سعید تم ہی سوچو ایک شریف عورت ایسا کیونکر کرسکتی ہے ۔

سعید ۔ جب وہ کالج میں پڑھ سکتی ہے ، غیر مردوں سے باتیں کرسکتی ہے (جوش سے) دوسروں سے ہنس بول سکتی ہے ، ساتھ ہی روشن خیال بھی ہے اور کسی سے محبت بھی کرتی ہے تو یقیناً ایسا بھی کرسکتی ہے ۔

نجمہ ۔ کیا ایسا کرنا بدنامی کا باعث نہ ہوگا ۔

سعید ۔ نہیں تو مجھ سے محبت تھی نا ۔

نجمہ ۔ تھی کیا اب بھی ہے اور آئندہ بھی رہے گی ۔

سعید۔ (زور سے) شرم نہیں آتی محبت کو بدنام کرتے ہوئے۔
نجمہ۔ میرے سعید! ایسا نہ کہو، میں آج بہت پریشان ہوں تمہاری یاد .... (روتی ہے)۔
سعید۔ (ہنستے ہوئے) آخر ہم بھی تو سنیں کیا قصہ ہے۔ (خاموشی)
قاسم۔ سرکار! یہ آج شام سے اسی طرح روئے جا رہی ہیں۔ بڑے سرکار پوچھتے پوچھتے ہار گئے، آخر مجھے بلایا۔
سعید۔ (تیز ہو کر) اپنی حماقت پر رونا عقلمندی کا کام نہیں۔
نجمہ۔ بس کرو سعید!
سعید۔ (دھیرے سے) یہ قدموں کی آواز کیسی ہے شاید .... (خاموشی)
قاسم۔ میں دیکھ آتا ہوں (باہر جاتا ہے اور تھوڑی دیر بعد)
نجمہ۔ آخر تمہارا اس اندھیری رات میں اس طرح پستول لئے ہوئے آنا کیا معنی رکھتا ہے۔
سعید۔ ہر رات اپنے اندر کئی جرم اور کئی گناہ چھپاتی آتی ہے، آج کی رات بھی ایک رات ہے اور.....
نجمہ۔ سعید خدا کے لئے ....
سعید۔ کر ہی کیا سکتا ہوں، سوا اس کے کہ بھیا کو مار ڈالوں یا پھر تمہیں یا پھر اپنے آپ ہی کو۔
نجمہ۔ میں تمہارے ہاتھ جوڑتی ہوں خدا کے لئے ایسا نہ کرنا میں صرف تمہاری یاد ہی میں زندہ ہوں۔ تم مجھے ہی مار ڈالو، میں تم سے محبت کرتی ہوں اور شاید تم بھی مجھ سے، تمہارا مجھ پر حق ہے۔ کسی اور کو مارنے کی کیا ضرورت۔
سعید۔ اچھا تو گویا آپ کو بھیا سے ہمدردی ہے۔
نجمہ۔ سعید! کیسی باتیں کرتے ہو، میں اب تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی، میں نے آج فیصلہ کر لیا ہے۔
سعید۔ مگر اب تو تم شادی شدہ ہو۔
نجمہ۔ تم اگر مجھے ساتھ نہ لے گئے تو یاد رکھو میں تمہیں یہیں پھنسا دوں گی!
سعید۔ (تیز ہو کر) بے شرم چپ رہو، اگر ذرا بھی زور سے آواز نکلی تو پستول چلا دونگا یہی محبت کا دعویٰ ہے تمہارا۔
نجمہ۔ لیکن میں اب تمہارے بھیا کے پاس نہیں رہ سکتی۔ مجھے تو تم مل گئے۔ دنیا کی کوئی طاقت اب

ہمیں جدا نہیں کر سکتی۔

سعید۔ (تیز ہو کر) یہ ٹھیک ہے میں بھی تم سے محبت کرتا ہوں اور شاید اسی محبت کے جذبے سے متاثر ہو کر یہاں آیا بھی ہوں لیکن اب تم جیسی بے شرم / بے وفا کے لئے زندہ رہنا زمین کے لئے مستقل ایک بوجھ ہے تم میرے لئے اسی وقت مر گئی تھیں جب بھیا نے تم سے شادی رچائی تھی۔

نجمہ۔ سعید...... میرے پیارے سعید! (گھبرائی ہوئی آواز میں)

سعید۔ (غصے سے) خاموش، جو کچھ ہونا تھا ہو چکا، اب موت کے لئے تیار ہو جاؤ، ایک......دو....

نجمہ۔ (بھرائی ہوئی آواز میں) کوئی آرہا ہے!

سعید۔ کمبخت کو اسی وقت مرنا تھا، اچھا ہے آجانے دو، شاید اس کا بھی آج ہی فیصلہ ہو جائے۔

(قاسم ہانپتا ہوا کمرے کا دروازہ کھول کر داخل ہوتا ہے اور زور سے دروازہ بند کرتا ہے)

قاسم۔ (گھبرائی ہوئی آواز میں) بڑے سرکار آرہے ہیں سرکار!

نجمہ۔ اب کیا ہوگا؟

سعید۔ وہی ہوگا جو میں سوچ کر آیا ہوں۔

نجمہ۔ اب بھی وقت ہے بھاگ جاؤ، مجھے بدنام نہ کرو۔ تمہارے بھائی کو شاید ہماری محبت کا علم ہو گیا ہے۔

سعید۔ (حقارت سے) بزدل، ڈرپوک، مجھے بھی بزدل سمجھتی ہو۔

قاسم۔ (گھبرا کر) سرکار یہ کیا کر رہے ہیں آپ، میں تو کہیں کا نہیں رہا، یا خدا!!

(اتنے میں تیز قدموں کی آواز آتی ہے اور پھر دروازے پر دستک)

رشید باہر سے پکارتا ہے، پہلے قاسم کو دو بار پھر بیگم کو۔ نجمہ دروازہ کھول کر باہر ہو جاتی ہے۔

رشید۔ کیوں، قاسم کیا سو گیا؟ تم کب سے اکیلی بیٹھی ہو۔

نجمہ۔ (گھبرا کر) چلئے، آئیے، قاسم ابھی ابھی سویا ہے۔ میں ڈر کی وجہ سے نہ آسکی، آپ اتنی دیر تک کیا کر رہے تھے۔

(دونوں گیلری میں چلتے ہیں اور پھر اپنے کمرے میں جا کر دروازہ بند کر لیتے ہیں)

رشید۔ کیوں بیگم، اب تو طبیعت ٹھیک ہے نا۔ تمہیں میری قسم اب تو بتا دو کیا بات تھی۔ تمہیں میری محبت کی قسم!

سعید۔ (زور سے) شرم نہیں آتی محبت کو بدنام کرتے ہوئے۔

نجمہ ۔ میرے سعید! ایسا نہ کہو، میں آج بہت پریشان ہوں تمہاری یاد .... (روتی ہے) ۔

سعید۔ (ہنستے ہوئے) آخر ہم بھی تو سنیں کیا قصہ ہے۔ (خاموشی)

قاسم۔ سرکار! یہ آج شام سے اسی طرح روئے جا رہی ہیں۔ بڑے سرکار پوچھتے پوچھتے ہار گئے، آخر مجھے بلایا۔

سعید۔ (تیز ہو کر) اپنی حماقت پر رونا عقلمندی کا کام نہیں۔

نجمہ ۔ بس کرو سعید!

سعید۔ (دھیرے سے) یہ قدموں کی آواز کیسی ہے شاید .... (خاموشی)

قاسم ۔ میں دیکھ آتا ہوں (باہر جاتا ہے اور تھوڑی دیر بعد)

نجمہ ۔ آخر تمہارا اس اندھیری رات میں اس طرح پستول لئے ہوئے آنا کیا معنی رکھتا ہے۔

سعید۔ ہر رات اپنے اندر کوئی جرم اور کوئی گناہ چھپاتی آتی ہے، آج کی رات بھی ایک رات ہے اور.....

نجمہ ۔ سعید خدا کے لئے ......

سعید۔ کر ہی کیا سکتا ہوں، سوا اس کے کہ بھیا کو مار ڈالوں، یا پھر تمہیں یا پھر اپنے آپ ہی کو ۔

نجمہ ۔ میں تمہارے ہاتھ جوڑتی ہوں خدا کے لئے ایسا نہ کرنا میں صرف تمہاری یاد ہی میں زندہ ہوں ۔ تم مجھے ہی مار ڈالو، میں تم سے محبت کرتی ہوں اور شاید تم بھی مجھ سے، تمہارا مجھ پر حق ہے ۔ کسی اور کو مارنے کی کیا ضرورت ۔

سعید۔ اچھا تو گویا آپ کو بھیا سے ہمدردی ہے ۔

نجمہ ۔ سعید! کیسی باتیں کرتے ہو، میں اب تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی، میں نے آج فیصلہ کر لیا ہے۔

سعید۔ مگر اب تو تم شادی شدہ ہو ۔

نجمہ ۔ تم اگر مجھے ساتھ نہ لے گئے تو یاد رکھو میں تمہیں یہیں پھنسا دوں گی!

سعید۔ (تیز ہو کر) بے شرم چپ رہو، اگر ذرا بھی زور سے آواز نکلی تو پستول چلا دونگا یہی محبت کا دعویٰ ہے تمہارا ۔

نجمہ لیکن میں اب تمہارے بھیا کے پاس نہیں رہ سکتی، مجھے تو تم مل گئے ۔ دنیا کی کوئی طاقت اب

ہمیں جدا نہیں کر سکتی۔

سعید۔ (تیز ہوکر) یہ ٹھیک ہے میں بھی تم سے محبت کرتا ہوں اور شاید اسی محبت کے جذبہ سے متاثر ہو کر یہاں آیا بھی ہوں لیکن اب تم جیسی بے شرم اور بے وفا کے لئے زندہ رہنا زمین کے لئے مستقل ایک بوجھ ہے تم میرے لئے اُسی وقت مر گئی تھیں جب بھیا نے تم سے شادی رچائی تھی۔

نجمہ۔ سعید...... میرے پیارے سعید! (گھبرائی ہوئی آواز میں)

سعید۔ (غصّے سے) خاموش، جو کچھ ہونا تھا ہو چکا، اب موت کے لئے تیار ہو جاؤ، ایک...... دو.....

نجمہ۔ (بھرائی ہوئی آواز میں) کوئی آ رہا ہے!

سعید۔ کمبخت کو اسی وقت مرنا تھا، اچھا ہے آجانے دو، شاید اس کا بھی آج ہی فیصلہ ہو جائے۔

(قاسم ہانپتا ہوا کمرے کا دروازہ کھول کر داخل ہوتا ہے اور زور سے دروازہ بند کرتا ہے)

قاسم۔ (گھبرائی ہوئی آواز میں) بڑے سرکار آ رہے ہیں سرکار!

نجمہ۔ اب کیا ہوگا؟

سعید۔ وہی ہوگا جو میں سوچ کر آیا ہوں۔

نجمہ۔ اب بھی وقت ہے بھاگ جاؤ، مجھے بدنام نہ کرو۔ تمہارے بھائی کو شاید ہماری محبت کا علم ہو گیا ہے۔

سعید۔ (حقارت سے) بزدل، ڈرپوک، مجھے بھی بزدل سمجھتی ہو۔

قاسم۔ (گھبرا کر) سرکار یہ کیا کر رہے ہیں آپ! میں تو کہیں کا نہیں رہا، یا خدا!

(اتنے میں تیز قدموں کی آواز آتی ہے اور پھر دروازے پر دستک)

رشید باہر سے پکارتا ہے، پہلے قاسم کو دو بار پھر بیگم کو۔ نجمہ دروازہ کھول کر باہر ہو جاتی ہے۔

رشید۔ کیوں، قاسم کیا سو گیا؟ تم کب سے اکیلی بیٹھی ہو۔

نجمہ۔ (گھبرا کر) چلئے ادھر آئیے، قاسم ابھی ابھی سویا ہے۔ میں ڈر کی وجہ سے نہ آسکی، آپ اتنی دیر تک کیا کر رہے تھے۔

(دونوں گیلری میں چلتے ہیں اور پھر اپنے کمرے میں جا کر دروازہ بند کر لیتے ہیں)

رشید۔ کیوں بیگم، اب تو طبیعت ٹھیک ہے نا۔ تمہیں میری قسم اب تو بتا دو کیا بات تھی۔ تمہیں میری محبت کی قسم!

نجمہ۔ نہیں کوئی بات نہیں تھی، یونہی دل بھر آیا تھا اور کچھ پرانی یادیں آ آ کر ستانے لگی تھیں۔

رشید۔ کس کی یاد آ رہی تھی جناب کو؟

نجمہ۔ چھوڑیے ان باتوں کو، یہ بتایئے آپ نے آنے میں اتنی دیر کیوں لگائی، میرا تو مارے ڈر کے دم ہی نکلا جا رہا تھا۔

رشید۔ اُدھر تم گئیں اور میں نے سوچا خط ادھورا پڑا ہے چلو پورا ہی کر لوں، بس اب لکھ کر فارغ ہوا تو فوراً تمہارے پاس ہی تو سیدھا آیا ہوں۔ لیکن پھر تم بات کو ہنسی میں ٹالنا چاہتی ہو، میں نے اس سے پہلے بھی تمہارے چہرے پر کچھ پڑھنے کی کوشش کی ہے اور کچھ پڑھا بھی ہے، کیا مجھے نہیں بتاؤ گی؟

نجمہ۔ کوئی بات بھی تو ہو، بس یونہی اندر سے دل اُمنڈ آیا اور رونے لگی۔

رشید۔ نہیں بیگم آج تو ہم پوچھ کر ہی رہیں۔

نجمہ۔ یہ کیا آپ نے بیکار کی ضد لگائی ہے، کہہ تو دیا کوئی بات نہیں۔

رشید۔ تم مجھ سے چھپا رہی ہو جس نے .... (سنجیدگی سے)

(باہر کچھ آہٹ سنائی دیتی ہے، رشید خاموش ہو جاتا ہے پھر کہتا ہے

رشید۔ یہ آواز کیسی ہے، ذرا دیکھ آؤں، کس غضب کا اندھیرا ہے، ایسی راتوں میں اکثر حادثات ہو جاتے ہیں۔

نجمہ۔ کوئی بھی نہیں ہے، بیٹھو بھی، ہاں تو میں نے کیا کیا؟

رشید۔ میں نے تمہارے لئے بہت کچھ کیا ہے، بہت کچھ اور اب......

(باہر قدموں کی آواز آتی ہے۔ رشید رک جاتا ہے۔ قدموں کی آواز کمرے کے پاس آ کر رک جاتی ہے)

رشید۔ بیگم ذرا دیکھ تو لینے دو، آخر ہے کون؟

نجمہ۔ رہنے بھی دو۔ قاسم ہو گا اور ہو کون سکتا ہے، مجھے دیکھنے آیا ہو گا، میں خود کہتی ہوں کہ جا کر سو جا۔

(دروازے تک جا کر اُسے کھولتی ہے۔ بھرائی آواز میں کہتی ہے رُکتے رُکتے)

جاؤ سو جاؤ (دروازہ بند کر کے واپس آتی ہے (پھر گھبرائی ہوئی آواز میں) کیا بہت کچھ کیا آپ نے؟

رشید۔ یہ تمہارا چہرہ ایک دم کیوں اُتر گیا۔ کیا بات ہے، باہر کون تھا؟

قاسم تھا اور اس کے علاوہ ہو کون سکتا ہے، (رُکتے ہوئے) آج طبیعت گری جا رہی ہے، سمجھ میں

نہیں آتا کیا کروں۔

رشید۔ قاسم چلا گیا۔

نجمہ۔ ہاں گیا اور کیا کھڑا رہتا۔ اور کچھ باتیں کیجئے تاکہ دل کچھ بہلے۔

رشید۔ ہاں تو میں نے آپ کے لئے کیا کیا؟ سنئے، پہلی بات تو یہ کہ آپ سے محبت کی اور آپ کے والدین نے ہماری جائداد سے۔

نجمہ۔ اب لگے شیخی بگھارنے۔

رشید۔ (سنجیدگی سے) نہیں مذاق نہیں، میں واقعی تم سے محبت کرتا ہوں لیکن تم شاید نہیں اور اگر یہ روپے اور جائداد نہ ہوتی تو تمھارے والدین اس رشتے پر کبھی راضی نہ ہوتے اور نہ تم ہوتیں اس لئے کہ میں نہ اتنا پڑھا لکھا ہوں، نہ کوئی ایسا خوبصورت ......

نجمہ۔ یہ کیا بیکار کی باتیں شروع کردیں، میرا دل گھبرا رہا ہے کوئی اور بات کیجئے۔

رشید۔ نہیں یہ بیکار نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ میں نے تمھارے لئے جو کچھ کیا اس پر اب خود میرا ضمیر مجھ پہ ملامت کر رہا ہے اور.....

(دروازے پر آہٹ سنائی دیتی ہے، رشید خاموش ہو جاتا ہے)

رشید۔ یہ آخر ہے کون، میں دیکھتا ہوں۔

نجمہ۔ ہوگا کوئی۔ آپ تو بیٹھے رہئے۔

رشید۔ چھوڑو بھی۔ دیکھ تو لینے دو۔

نجمہ۔ نہیں جی کتا وغیرہ ہوگا۔ ایسی اندھیری رات میں تو چور بھی نکلتے ڈرتے ہیں۔ میرا تو دل کچھ بیٹھا جا رہا ہے۔

رشید۔ ہاں تو نجمہ خود میرا ضمیر مجھے ملامت کر رہا ہے اور مستقل ایک ذہنی کوفت رہتی ہے۔ پوچھتی ہو تو سنو۔ یہ سب تمھارے لئے ہی کیا اور تم ہی میری نہ ہو سکیں۔

نجمہ۔ (جلدی سے) آخر کونسا ایسا کام کیا ہے آپ نے جو ضمیر ملامت کر رہا ہے، مجھ سے شادی کرنے پر۔

رشید۔ نہیں نجمہ یہ بات نہیں۔ اب تم بھی سن ہی لو، شاید اس سے میرا بار کچھ ہلکا ہو جائے۔ میں نے اپنے بھائی پر بہت ظلم کیا۔ میں نے اُسے پالا، پوسا، لاڈ پیار سے بڑا کیا پھر اُسے تعلیم بھی دلوائی لیکن

(باقی ص۔

ہماری افسانہ نگاری

حضرت اختر انصاری اکبرآبادی

(گذشتہ سے پیوستہ)

تاریخی ریویو | افسانہ فنون لطیفہ کی مانند ہر عہد و زمانہ میں مقبول رہا۔ ہر شخص کو زندگی کے کسی نہ کسی پہلو سے ضرور غیر معمولی دلچسپی ہوتی ہے۔ افسانہ اس قسم کی دلچسپی کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔ اس کی ابتداء آفرینش حیات عالم سے مربوط ہے بلکہ تاریخی صفحات پکار پکار کر کہتے ہیں کہ تاریخ کی ابتدائی منزل میں اسی قسم کے افسانے خیالی قصے تھے۔ جنھوں نے ہمارے اندر عقیدہ بن کر جڑ مضبوط کرلی ہے۔ انھیں وہمی اور خیالی قصص پہ افسانے کی پوری عمارت قائم ہے۔ زمانہ کی ترقی کے ساتھ افسانہ بھی اپنا رنگ بدلتا رہا ——— لوگ پرانے قصے اور کہانیوں میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں ——— کیوں ——— ؟ اس لئے کہ اس میں ماڈتی چاشنی کے علاوہ روحانی غذا بھی ہوتی ہے

ہر ادب میں نثر سے پہلے نظم آتی ہے۔ چنانچہ راماین مہابھارت کی روحانی قوت اور زور کا پتہ چلتا ہے بھیم اور ارجن کی بہادری ہمارے دلوں میں اثر کرتی ہے۔ بہرحال ہندوستان میں فنِ داستان گوئی بہت قدیم ہے۔ مذہب نے افسانہ گوئی میں بہت مدد کی ہے۔ اردو میں قصہ گوئی کی ابتدا اس زبان کی پیدائش ہی سے وابستہ ہے۔ اردو میں بھی نظم نے پہلے فروغ حاصل کیا۔ چنانچہ پرانے قصے بھی نظم ہی میں پیش کئے گئے۔ پہلے یہ قصے اخلاق پر زور دیتے تھے۔ دکن کی دولت نے رنگ دکھایا اور رومانی قصے بھی اردو میں نظر آنے لگے۔ وقار عظیم کہتے ہیں۔

"انیسویں صدی کے شروع میں بعض ناول نگاروں نے مختصر افسانہ کی بنیاد ڈالی لیکن ان مختصر افسانوں میں عموماً اخلاقی جزو بے حد نمایاں رہتا ہے"

اُنیسویں صدی | سلطنت مغلیہ کی بنیادیں کھوکھلی ہوگئیں اور شاہی شان و شوکت پر نکبت و بدبختی کی تیرہ و تار گھٹائیں چھانے لگیں۔ دہلی کے در و دیوار ماتمی لباس پہن کر اپنی لٹی ہوئی دولت پر مرثیہ خوانی کرنے لگے، ہر طرف طوائف الملوکی کا دور دورہ ہوا۔ مگر طفل اردو شباب کے مرثیے میں اینڈتا رہا۔ حتیٰ کہ بنگال نے نئی حکومت کا خیر مقدم کیا۔ اور ہندوستانیوں کو بادلِ ناخواستہ خوش آمدید کہنا پڑا اور نہ کہتے تو چارۂ کار ہی کیا تھا ...... نئی تعلیم پھیلی۔ نئی صبح نئی روشنی کے ساتھ نمودار ہوئی۔ کلکتے میں فورٹ ولیم قائم ہوا، یہ وہ وقت تھا جبکہ یورپ ہر ملک و قوم کے سامنے بہترین افسانہ پیش کرچکا تھا اور اس کی مقبولیت نے حکام کے دل موہ لئے تھے۔ جب طفلِ اردو کی پرورش کی

ثمانی تو طویل افسانوں ہی سے شروع کیا، چنانچہ اردو کی سب سے پہلی کتاب میں "باغ و بہار" سب سے بڑا اور ممتاز افسانہ ہے۔

کہا جاتا ہے کسی زمانے کا ادب اپنے ماحول سے بیگانہ نہیں رہ سکتا اور اس زمانے کی زندگی کی تصویر ہوتا ہے۔ یہ بالکل درست ہے کہ وسط انیسویں صدی میں ہندوستان میں سراسیمگی پھیلی ہوئی تھی۔ ہر طرف اضطراب لوٹے چینی کی مات نمی ـــــــــــ ذہنی حکومت کی جڑیں اتنی مضبوط ہو گئی تھیں، مادی بدنظمی نے اس درجہ حالات کو تبدیل کر دیا تھا کہ تھوڑے سکوں پر ان کی راست بازی، پاک دامنی اور خودداری خریدی جا سکتی تھی۔ چنانچہ اس زمانے کی عجب داستانیں اسی رنگ کی آئینہ دار ہیں۔

غدر کے بعد نئی حکومت قائم ہوئی۔ پرانی تہذیب نے وہ ورق پلٹا تو ادب کیسے پیچھے رہ جاتا؟ اس نے بھی قدم بڑھائے اور اصلاحات کی تحریک شروع ہوئی۔ کس میرسی کے عالم میں افسانوی دنیا کے لئے بہت سے مضامین موجود تھے۔ مثلاً غلامی کی ذہنیت کا پردہ اٹھانا۔ لٹی ہوئی شان کی مرثیہ خوانی کرنا۔ انسانیت کی بے چارگی کا احساس کرانا۔ اخلاق کی پستی کا دھیان میں لانا، سوسائٹی کی برائیاں وغیرہ۔ چنانچہ حالی نے مسدس کے ذریعے، سرسید نے اپنے مضامین اور خطبات کے ذریعہ، ڈاکٹر نذیر احمد نے اپنے گھریلو قصوں کے ذریعے ہندوستان کی اصلاح کی کوشش کی۔ یہیں سے اردو ناول نگاری کی بنیادیں بھی مضبوط ہوتی ہیں۔ حالی نے مرض تشخیص تو کیا مگر اس کی دوا نہ بتا سکے۔ سرسید نے نئی روشنی کا علم اٹھایا، ڈاکٹر نذیر احمد نے خاندانی اور سوسائٹی کے نقائص پر نکتہ چینی کی۔ راشد الخیری کے دردناک افسانے اور حسن نظامی کی قلعہ معلی کی داستانیں اب بھی بے اختیار رقت طاری کرتی ہیں۔

غدر کے بعد انیسویں صدی میں عام طور سے طویل افسانے لکھے گئے۔ افسانے انسانی فطرت سے بالاتر، مختصر افسانوں کی بنیاد کب اور کیسے پڑی اس کا پتہ نہیں ـــــــــــ زیادہ چھان بین کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا سہرا آزاد کے سر ہے۔ آزاد کی نیرنگ خیال جب منظر عام پر آئی تو تمثیل نگاری کا رنگ بھی نکھرا۔ آزاد کے اس رنگ کی پیروی ناصر علی نے بھی کی مگر اتنی کامیابی نہ حاصل ہوئی۔ ان کے بعد اردو میں افسانہ نگاری نے باقاعدہ ایک فن کی حیثیت حاصل کر لی۔

بیسویں صدی | اسی صدی میں جدید تعلیم نے اپنا سکہ جمایا۔ لوگوں میں احساس خودداری پیدا ہو گیا اور انقلاب کی رفتار بھی بہت سرعت کے ساتھ بڑھ گئی۔ ادب کی ہر صنف نے ترقی کی، چنانچہ اردو افسانہ نگاری بھی اس رنگ سے بے بہرہ نہ رہی۔ یہ وہ وقت تھا جبکہ ہندوستان میں اخبار اور رسائل عام ہو چکے تھے۔ رسالوں میں ہر قسم کا لٹریچر جگہ پا چکا تھا۔ ان رسالوں کی ترقی سے افسانوں کی ضرورت میں اضافہ ہو گیا۔

ملک کے سامنے غیر ملکی حالات کو رکھ کر ان کو پرانی عظمت کی داستانیں سنائی تھیں۔ چنانچہ اس دوران میں ترجمہ نے فروغ حاصل کیا۔ اس صنف میں سجاد حیدر کے ترکی افسانوں کے ترجمے اور نیاز فتحپوری کے مختلف ترجمے پیش پیش ہیں۔ مختصر افسانوں میں مغربی تہذیب کی برائیاں سلطان حیدر جوش نے پیش کیں۔

پہلی جنگ عظیم اور اس کا اثر: جنگ ہر ادب اور ہر قوم کی زندگی پر نمایاں اثر کرتی ہے۔ چنانچہ پہلی جنگ عظیم نے اردو افسانہ نگاری کے اندر گویا دم عیسیٰ پھونک دیا، اس کی رفتار میں برق کی سی سرعت پیدا کر دی۔ اس جنگ کے بعد اردو افسانہ نگاری نے حقیقی خوش اسلوبی سے زندگی کی قدروں کو تسلیم کر کے اس کے ملانے کی کوشش کی، دنیا کا کوئی ادب پیش نہیں کر سکتا۔ ہمارے ادیبوں کے دماغ میں یہ احساس پیدا کر دیا کہ افسانے سماجی زندگی کی پیچیدگی کے احساس کے بغیر وجود میں نہیں آ سکتے اور یہ کہ ہمارے افسانوں کو اجتماعی اور معاشرتی محرکات کا آئینہ ہونا چاہیئے۔

گذشتہ بیس سال میں افسانے نے حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ کوئی رسالہ، کوئی جریدہ یا مجلہ اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک اس میں اعلیٰ افسانوں کی چاشنی موجود نہ ہو۔ رسائل کی زیادتی کے ساتھ افسانہ نویسوں کی تعداد میں بھی زیادتی ہوتی گئی، چنانچہ اس مختصر مضمون میں سب کا تذکرہ ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ ان تمام افسانوں کی اہم خصوصیات زندگی فطری، سیاسی، سماجی، تاریخی، قومی، اقتصادی اور معاشرتی خصوصیات اور انقلابات ہیں۔ پریم چند، سدرشن، علی عباس حسینی، فضل حق قریشی، احمد ندیم قاسمی کے افسانے قابل قدر ہیں۔

ابتدا میں ہر چیز میں کوئی نہ کوئی نمایاں کمی رہ جاتی ہے۔ چنانچہ اردو افسانہ نگاری میں بہت سی خرابیاں تھیں، مثلاً نفسیات اور منطق کی نمایاں کمی تھی۔ کردار نگاری بھی بہت پیچھے تھی۔ اب یہ صنف تیزی سے ترقی پذیر ہے۔ ہمارے افسانہ نگاروں نے بہت سے نقائص دور کر دیئے ہیں، بلکہ اس میں روز بہ روز دلکشی پیدا ہوتی جا رہی ہے۔

مقامی رنگ: موجودہ افسانوں میں سب سے نمایاں خوبی مقامی رنگ ہے۔ اس خوبی میں پریم چند کے افسانے بہت پیش پیش نظر آتے ہیں۔ انھوں نے پہلی مرتبہ ملک کے لئے تاریک یا دھندلے معاشرتی رنگ کو، قوم کے سامنے پیش کیا۔ سدرشن نے بھی اس کی پیروی کی۔ یہاں کے لوگوں کے رہنے سہنے کے طریقے، ان کے عادات و اطوار کا چربہ اتارا۔ ڈاکٹر اعظم کریوی اس صنف میں نمایاں ہیں۔ ان کے افسانوں میں ہندو مسلم

اتحاد کی بو پائی جاتی ہے، جو ہندوستان کی موجودہ مکدر فضا کے لئے بہت مفید اور کار آمد ہے۔

ہندوستان کی قدیم تاریخ یہاں کے لوگوں میں بیداری کی روح پھونکنے کے لئے بہت کافی ہے۔ راجپوتوں کی بہادری کی داستانیں یہاں کے موجودہ بزدل نوجوانوں کے دل میں نیا خون دوڑا سکتی ہیں۔ پریم چند کے علاوہ حسینی صاحب نے بھی اس مواد سے فائدہ اٹھایا ہے۔

دنیا کی زندگی کا نقشہ مجنوں گورکھپوری، نیاز فتحپوری اور سدرشن نے بہت خوش اسلوبی سے کھینچا ہے لیکن زیادہ تر نیاز صاحب کا جادو نگار قلم دنیا دار ملاؤں کی گمراہیوں کو موڑتا ہے۔ مجنوں کے افسانوں میں اس کا محرک قنوطیت خیز جذبہ ہوتا ہے جس کو وہ "عبرت" کہتے ہیں۔ بقول رشید احمد صدیقی یوں سمجھئے کہ مجنوں نے اپنی شخصیت کی تہذیب و تکمیل زندوں سے نہیں بلکہ مردوں سے کی ہے۔ ان کے یہاں قنوطیت کی تند گھٹائیں چھائی رہتی ہیں۔ افسر میرٹھی اور ایم اسلم بھی اس رنگ میں فرد ہیں۔

بیسویں صدی میں افسانوں کا سب سے بڑا مقصد اصلاح قوم تھا چنانچہ ہمارے ادیبوں سلطان حیدر جوش نے مغربیت کی دھجیاں اڑائیں۔ راشد الخیری نے نسوانی دنیا میں اصلاح کی کوشش کی۔ پریم چند نے ہماری مردہ ذہنیت کی اصلاح راجپوتوں کی بہادری کے قصے سنا کر کی۔ سدرشن نے ہندوستان کے گھر گھر کا چکر لگایا اور ان کی گھریلو زندگی میں کرید کرید کر برائیاں نکالیں۔ افسر نے ایک واعظ کا درجہ حاصل کیا، جو پکار پکار کر کہتا ہے کہ اے ہندوستان کے باشندو! تم میں پستی احساس اب مہلک حد تک پہنچ گیا ہے، تم چونکو اور اپنے مرض کا علاج کرو۔

عظیم بیگ چغتائی انسانی کمزوریوں سے واقف ہیں۔ وہ ان برائیوں پر مزاحیہ اور طنزیہ طور پر حملہ کرتے ہیں، سجاد حیدر، نیاز اور مجنوں کے متعلق وقار عظیم لکھتے ہیں۔

"ان کے افسانوں میں اصلاحی مقصد نہیں تو نہ ہو لیکن وہ ہمارے دلوں کو دنیا کے تمام لطیف اور کیف آور عناصر سے توضرور آشنا کرتے ہیں"

سادگی زبان کے لحاظ سے حسن نظامی کے افسانے دل و جگر میں نشتر کی طرح چبھتے ہیں۔ وہ سلطنت مغلیہ کی بربادی پر بلک بلک کر رو دیتے ہیں۔ ان کی آسان نگاری نے تخئیل نگاری کے ساتھ ایک لاثانی فن کی شکل اختیار کر لی ہے۔

رومانی دنیا میں اور ترجمہ کی حیثیت سے ایم اسلم کے افسانے بھی ادب میں ایک غیر معمولی جگہ حاصل

کر چکے ہیں۔ مگر اِن کی زبان میں ٹھہراؤ نہیں۔ اِن کا قلم روکا نہیں جا سکتا۔ بیک وقت دو تین افسانے لکھ بیٹھتے ہیں گویا اُن کا دماغ "بیسویں صدی کی بجلی کی مشین" ہے۔ مکالمہ لکھتے میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں اور اکثر گم ہو جاتے ہیں۔

جدید افسانہ نگاری۔ گذشتہ چند سالوں میں ادب کی زندگی کے ہر شعبے میں، تبدیلیاں ہو گئی ہیں جس کا ایک پہلو نیا ادب یا ترقی پسند ادب کے نام سے زیادہ یاد کیا جاتا ہے اس کی تفصیل میں جانے کا وقت نہیں مگر افسانوی دنیا میں جو انقلاب اس ادب نے پیدا کیا ہے اس کا تذکرہ مختصر طور سے کرتا ہوں۔

پریم چند بھی اس تحریک سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے تھے۔ آخری زمانے کے افسانوں کو اسی نئے رنگ میں رنگ دیا۔ گویا اس رنگ نے ان کی سیاہ ڈاڑھی پر خضاب کا کام کیا۔ قاضی عبدالغفار نے "لیلےٰ کے خطوط" کے ذریعے افسانہ نگاری کو نئے راستے سے آشنا کیا اور رومانی دنیا میں انقلاب پیدا کیا۔ دہلی کی رجعت پسند زندگی اور دلچسپ مشغلوں کا تذکرہ اس دور کے لکھنے والوں میں انگارے کے مصنف احمد علی صاحب نے خوب کھینچا ہے۔ ان کے کرداروں میں سے استاد "شمو" بہت نمایاں اور کبوتر بازی میں فرد ہیں۔ یہ اصل میں نئی تحریک کے ابتدائی افسانہ نویسوں میں سے ہیں کہ اس لئے ترتیب یا ٹیکنک کی خامیاں قابل قبول ہیں۔ سجاد ظہیر صاحب نے بھی لندن کی ایک رات کے ذریعے ناول اور افسانہ کی دنیا میں ایک عجیب کیف آور صور پھونکا ہے۔ اس میں انگریزوں اور ہندوستانیوں کے سیاسی، معاشرتی تعلقات پر بحث کی ہے۔ نعیم کا کردار اس کتاب کی بہترین پیشکش ہے۔

فن کے لحاظ سے افسانہ کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ اس ... سے اوپندر ناتھ اشک اور ان کا نام کرشن چندر سے چھوڑنا بڑی غلطی ہوگی۔ وہ افسانے کی ابتدا، اٹھان اور اس کے خاتمے کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ اشک کے افسانوں میں بڑی داخلیت ہے۔ افسانہ پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ آپ بیتی بیان کر رہے ہیں۔ کرشن چندر کے متعلق عزیز احمد صاحب لکھتے ہیں:-

"تمام ترقی پسند ادیبوں میں کسی کا نام اس قدر توصیف اور عزت کا مستحق نہیں جتنا کرشن چندر کا ہے۔ اس کی وجہ ان کی بے لوث اور باخلوص انسانیت ہے، جو ان کی تحریر سے مترشح ہوتی ہے۔ اس پر ان کے تخیلی فن کی بنیاد ہے۔"

کرشن چندر مظلوموں سے سچی ہمدردی اور مزدوروں سے دلی انس رکھتے ہیں۔ وہ مزدور مرد سے زیادہ عورت کے افسانہ نگار ہیں۔ "شکست" میں ہندوستانی عورت کا سچا نقشہ کھینچا ہے۔ آپ کی انقلابی رومانیت نے عورت کو نیا رنگ بخشا ہے۔ منظر کشی کے اعتبار سے کرشن چندر کا کوئی مقابل نہیں۔ آرٹ اور ترتیب کے

لحاظ سے ان کے افسانے سب نادر ہیں - کردار نگاری میں بڑی انفرادیت ہے -

افسانے کے اثر کو تعاطی کم کرتی ہے - انسان کی داخلی ضروریات اور فطرت کے خارجی اظہارات کی ہم آہنگی افسانوں کی جان ہے، جو کرشن چندر کے یہاں بسیط انم ہے - ان کے اسلوب میں ایک انقلابی رمزیت ہے، نئی تشبیہات سے ان کے افسانے مالا مال ہیں، طنز کے پیرایہ میں اثر خوب پیدا کر دیتے ہیں -

راجندر ناتھ بیدی کے افسانے بے لوث رومانیت اور نتیجہ خیز تخلیلی امتزاج ہیں - بیدی کے افسانوں کا مجموعہ "دانہ و دام" نئے ادب میں امتیازی حیثیت رکھتا ہے - ان کے افسانوں کا ماحول، دیہاتی ہے - اس کے مسائل، اس کی گندی معاشرت، اس کے مصائب ان کے خاص پہلو ہیں - صاحب ترقی پسند ادب کا قول ہے کہ

"بیدی کے افسانوں میں زندگی کی تلخی اور اس کی مصیبتوں کے ساتھ تھوڑا سا وہ لطف بھی ہے جو ان مصائب میں ہلکی سی روشنی پیدا کر دیتا ہے یہ لطف محبت اور ہمدردی کا ہے"

طنز کا حربہ بھی اکثر استعمال کرتے ہیں -

حسینی کا افسانہ ہندو مسلم اتحاد کے لئے "ایک ماں کے دو بچے" افسانوی دنیا میں بہت کامیاب رہا -

سعادت حسن منٹو نے بھی افسانوی دنیا میں کافی دلچسپی کا سامان مہیا کر لیا ہے - ان کا انجام قطعی غیر متوقع ہوتا ہے - ان کے افسانوں کے موضوعات میں غضب کا تنوع ہوتا ہے - عام خوبیوں کے باوجود ان کے یہاں انسانیت کا راسخ عقیدہ کہیں نہیں ملتا -

ترقی پسند ادب کی محض سرپرستی اور رخا توں پرستی مقصود ہو تو عصمت چغتائی کا نام بھی شامل کیا جا سکتا ہے - ان کا رجحان منٹو سے زیادہ رجعت پسند اور مریضانہ ہے - ان کی طرز تحریر میں نسائیت تو بہت ہے مگر تحریر کی باگ ڈور اکثر ان کے ہاتھ سے چھوٹ جاتی ہے -

افسانہ نگاری کے مختصر تنقیدی اور تاریخی تبصرے کے بعد میں یہ ضرور کہوں گا کہ ہندوستان میں باوجود اس کثرت کے اب بھی اچھے افسانہ نگاروں کی کمی ہے - ہمارا ادب خواہ نیا ہو یا پرانا، اخلاقی اور سماجی، معاشرتی اور اصلاحی افسانوں کی نمایاں کمی رکھتا ہے - سردست ایسے افسانوں کی ضرورت ہے جو حسن و عشق کی داستانوں کو ایک طرف رکھ کر قومی ہمدردی اور باہمی مروت کی جڑیں مضبوط کریں - قومیت کے سوئے ہوئے جذبے کو بیدار کریں مردہ روحوں کے لئے صور حب قومی پھونک کر نئی صبح و شام دکھا دیں *

(مزاحیہ)

دیدہ خواہد شد

شارر کسمنڈوی لکھنؤ

میں اکسائز انسپکٹر ہوں یا خدائی فوجدار یا بُوا نفیسن کے بقول "راہ کا سانڈ" اس کا فیصلہ ناظرین کے ذوقِ سلیم اور فکر بقدرِ ہمت پر چھوڑتا ہوں، بہ ظاہر جو کچھ بھی ہوں لیکن حقیقت ہے کہ اپنے کام میں انتہائی ہوشیار و تجربہ کار ہوں یا یوں کہہ لیجئے کہ اول درجے کا چالاک اور مکار۔ کمشنر مجھ پر بہت اعتماد کرتے ہیں، کوئی بات جھوٹ بھی کہہ دوں تو سچ مان لیتے ہیں، سپرنٹنڈنٹ سے البتہ نہیں نبھتی، وجہ یہ ہے کہ میرے حلقہ کی بالائی رقم میں حصہ چاہتے ہیں، لیکن میں ایک پائی بھی دینے کا روادار نہیں، کیوں دوں بھلا اور کیوں نہ دوں؟ اس بحث میں نہ پڑیے ایک پرانی مگر چلتی پھرتی ہوئی بات سن لیجئے "دُکھ سہیں بی فاختہ اور کوّے انڈے کھائیں" تو میاں انڈوں کی اس قدر روانی اور گرانی کے زمانے میں بی فاختہ ایسی کہاں کی گئی گذری، گری پڑی اور بھولی بھالی ہیں کہ اس کڑی کو جھیل لیں گی اور اپنے "پارہ ہائے دل" انڈوں کو کسی اور کے تنورِ شکم کا ایندھن بننے دیں گی۔ سپرنٹنڈنٹ اپنی ڈالی مجھے چین نہیں لینے دیتے۔ ٹکڑ پیچ لگاتے اور روڑے اٹکاتے رہتے ہیں، مگر مجھے بھی گردن ناپنے کا گُر خوب آتا ہے۔ کمشنر کو ڈالیوں اور مربھکّے اہلکاروں کو بخشش کے ذریعہ اپنا بنائے رکھنا بائیں ہاتھ کا کرتب ہے، اور یوں بھی کمشنر انگریز ہیں، اُن کو ان خرافات سے کچھ زیادہ سروکار نہیں۔ وہ تو بس کام میں مستعدی، ضابطہ کی خانہ پُری اور ڈپارٹمنٹل دیانتداری پر نظر رکھتے ہیں، اپنے بطن اور توند کا وزن ماتحتوں نے حلوے اور پراٹھے پر ہاتھ صاف کر کے نہیں بڑھاتے، پھر بھی وہ جو مشہور ہے کہ افسر مٹی کا بھی بُرا ہوتا ہے۔ سپرنٹنڈنٹ کی مخالفت کبھی کبھی کچھ نہ کچھ آزار پہنچا ہی دیتی ہے۔ گذشتہ دو سال سے ایک ایسے حلقہ میں تعینات تھا، جہاں کھانا تک اپنی گرہ سے کھانا پڑتا تھا۔ شاید اس کا آپ کو علم نہ ہو کہ ایک اکسائز انسپکٹر کے لئے اپنی جیب سے کھانا فراہم کرنا معیوب ہی نہیں بلکہ حرام ہے، اور جو اس پر قدرت نہیں رکھتا وہ نااہل اور نادان سمجھا جاتا ہے، میں نااہل اور نادان ہوتا تو اس ذلت کو محسوس نہ کرتا مجھے یہ چیز بہت سے زیادہ بھاری معلوم ہوتی تھی اور اپنی تنخواہ اور الاؤنس کی بربادی دیکھی نہ جاتی تھی۔ پھر تنخواہ ہے ہی کتنی یہی مع الاؤنس گرانی سوا سو روپیہ ماہوار، گویا دال میں نمک، جب تک چرندم خورندم کے لئے اناپ شناپ پیسے نہ ہوں گنی بوٹیوں اور پتلے شوربے سے کہیں کسی اکسائز انسپکٹر کا پیٹ بھر سکتا ہے!

اونٹ کے پیٹ میں زیرے کی جو حالت ہوتی ہے، وہی تنخواہ کی صورت سمجھئے، دو سال تک "مقدر کا ستارہ"

گردش میں ہفتے کے بعد اب عروج پر آیا ہے۔ کمشنر نے اپنے اختیاراتِ خصوصی سے مجھے ایک زرخیز علاقے میں تبدیل کر دیا ہے، جہاں یکم مئی سے کام کر رہا ہوں۔ اور اسی مہینے کے ہفتۂ اول کی تاریخ وار ڈائری حرام و حلال کی تمیز کئے بغیر ایمانداری کے ساتھ پیش کرنا چاہتا ہوں، ممکن ہے میرے معاصرین کو یہ صاف گوئی گراں بھی گزرے اور ہنگامہ بھی پڑے، لیکن میرے پیٹ میں جو قراقر اور اینٹھن ہو رہی ہے، اس کا واحد علاج یہی ہے کہ کچھ تھوڑا بہت خلقِ خدا کی نفع رسانی اور محکمے کی اطلاع و آگاہی کے لئے اُگل دوں۔ چونکہ میں عنقریب پنشن پر سبکدوش ہو رہا ہوں اس لئے میرے روزنامچے کا یہ سیاہ ورق اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے کا مصداق نہ بن سکے گا۔

یکم مئی ۱۹۴۰ء یہ بہت بڑا حلقہ ہے، آج کا دن حلقے کے سپاہیوں سے بات چیت اور پوچھ گچھ میں گزرا، لائسنسداروں کا ریکارڈ دیکھا، ان کی مالی پوزیشن کا پتہ لگایا، جواہرات اور سنگ ریزوں میں تمیز پیدا کی، اپنی رفیقۂ حیات سرخ موٹی پنسل کو دعوتِ انتخاب دی، اس نے پاؤں کہیں ٹکے، کہیں اکھڑے اور کہیں چیچک کے گہرے داغ کی طرح جم کر رہ گئے یعنی پارٹی کے چوٹی کے لیڈروں کے نام پر تیلی کی شکل کا نشان بنایا، درمیانی پر ٥ گول دائرہ اور معمولی پر + صرف چوپارہ، اس موقعے پر اپنی ذہانت سے کام لیجئے ان نشانوں کا مطلب مجھ سے نہ پوچھئے۔ سپاہیوں سے معلوم ہوا کہ ان لائسنسداروں میں ایک بھی ایسا نہیں جو کم وزنی، ناجائز فروشی، در نشہ آور اشیاء میں آمیزش سے پرہیز کرنے والا ہو۔ اس چھان بین سے چھٹی ملی تو تھانے دار اور تحصیلدار سے ملاقات کی۔ ان سے خوب گھل مل کر میٹھی میٹھی باتیں رہیں۔ ان لوگوں کے انداز گفتگو اور ٹھاٹ باٹ سے میں نے سمجھ لیا کہ یہ بھی چور کے بھائی گرہ کٹ ہی ہیں، میرے معاملات میں دست اندازی نہ کریں گے، گویا ہم سب ایک ہی کشتی کے مسافر، ایک ہی حمام کے ننگے اور ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ اب کیا تھا بتیاں پہلے ہی کونوال تھے، رات فراغت سے گذری، خوب اینڈا اینڈ کر سویا، بالائی کے اعتبار سے یہ دن خالی گیا مگر جن ڈنڈ ل سٹوں میں گذرا وہ سوا لاکھ سے کم وزن نہیں رکھتا۔

۲ر مئی: صبح سویرے اٹھا، جذبات میں شگفتگی، خیالات میں بلندی اور طبیعت میں ایک خاص امنگ اور چستی محسوس کی۔ ضروریات سے فارغ ہو کر ایک کوڑھی فقیر کا بھیس بنایا۔ میرے پاس اس ضرورت کے لئے کافی سامان رہتا ہے کیونکہ بغیر اس کے جرائم پیشہ اور موذی خوردہ فروش قابو میں نہیں آتے، بھیس بدل کر چور دروازے سے دبے پاؤں باہر نکل گیا اور دس بیس قدم ہی چلا تھا کہ ایک بزرگ صورت انسان سے مڈبھیڑ ہوئی، ان بیچارے نے مجھے سچ مچ کا معذور فقیر سمجھ کر بے مانگے ایک چونی عنایت کی، میں نے "اللہ بھلا کرے بچہ" کہتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر لے لی جب کبھی میں فقیر کے بھیس میں شہر کا گشت کرتا ہوں تو فی گھنٹہ دس بارہ آنے سے کم کا اوسط نہیں پڑتا، کیا کروں

قبول نہ کریں تو لوگ مذاق اڑاتے ہیں اور انشائے راز کا ڈر الگ رہتا ہے، لیکن میں نقیری کی آمدنی کسی نیک کام میں نہیں لگاتا، بلکہ شراب نوشی، سینما بازی اور شاہد نوازی میں صرف کر دیتا ہوں، ان پیسوں کا اور کوئی دوسرا مصرف سچ پوچھئے تو میری سمجھ میں آیا ہی نہیں۔ اچھا کرتا ہوں یا برا، اس کا جواب کسی مولانا صاحب یا پنڈت جی سے پوچھئے۔ خیر، چونکہ نیا تھا، راستوں، کوچوں اور گلیوں سے ناواقف تھا اس لئے راہ گیروں سے پوچھتا پوچھتا افیون کی دکان پر پہنچا، وہاں کچھ خارش زدہ اور سیاہ پھول کی طرح مرجھائے اور چوسے چوسائے افیونی تال سم کے ساتھ کھانسنے اور عادی کی طرح حلق سے کثیف و بھد بلغم کے گولے پر گولے اگلنے میں مصروف تھے یہ منظر بڑا دردناک اور بھیانک تھا، اپنے ہی طرح نیک اور شریف انسانوں کو افیون نوشی کے مرض میں اس بری طرح مبتلا دیکھ کر دل پر ایک چوٹ سی لگی، مگر یہ چوٹ گہری نہیں بلکہ ہلکی سی تھی۔ اس قسم کے گھناؤنے مناظر بے بارہا نظر سے دیکھ چکا تھا، اس لئے ان میں میرے لئے تاثرات و عبرت کے کچھ زیادہ وافر و پر اسباق نہ تھے۔ میں بھی ان کھانسنے والوں کی صف میں شامل ہو گیا اور بناوٹی کھانسی کھانستا رہا، خوردہ فروش دو گھنٹے کی تاخیر سے آیا، غالباً ناجائز مال کی فراہمی کے سلسلہ میں لیٹ ہوا۔ جب وہ تنہا رہ گیا تو میں نے دس تولہ افیون کی خریداری کے لئے کہا۔ اس نے پہلے تو مجھے سر سے پاؤں تک خوب گھورا، پھر ادھر ادھر گہری نظر سے دیکھا اور ڈیوڑھی قیمت وصول کرکے پڑیا میرے حوالے کر دی، اور کہا، بڑے صاحب یہاں سے جلد بھاگ جاؤ بڑا حرام خور انسپکٹر بدل کر آیا ہے، سن گن پا گیا تو ننگا کرکے چھوڑے گا، اس کے منہ میں بڑے بڑے دانت ہیں اور ہر دانت انتہائی زہریلا اور تیز ہے۔

دکان دار کے ان الفاظ پر مجھے بڑی حیرت ہوئی، یہ کمبخت مجھے کہاں سے جانتا ہے، اور یہ کس طرح میرے خصائل حسنہ اور اوصاف پسندیدہ سے باخبر ہے۔ مگر اب تو اس کی چوٹی دب چکی تھی، اس نے بیک وقت تین جرموں کا ارتکاب کیا تھا، افیون سرکاری اسٹور کی نہ تھی، قیمت ڈیوڑھی اور مقدار غیر قانونی " یوں آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا "۔ جب اسے معلوم ہوا کہ وہ حرام خور انسپکٹر میں ہی ہوں جس سے وہ ڈر رہا تھا تو اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے، رنگ زرد اور چہرہ فق ہو گیا، بے اختیار قدموں پر گر پڑا۔ بے انتہا منت و سماجت کے بعد اپنی کمر سے دو سو کے نوٹ نکالے اور زبردستی میری جیب میں ڈال دیئے۔ میں نے کہا پہلی غلطی ہے معاف کرتا ہوں، آئندہ ایسا نہ کرنا اور نہ مجھے حرام خور سمجھنا، میں ضابطے کا پابند ہوں اور اس کی خلاف ورزی کرنے والوں کا دشمن، اور دیکھو ہر مہینے کی پہلی کو اسی قدر رقم مجھے بے طلب پہنچتی رہے، اس کے علاوہ گھوڑے اور مہمانوں کا خرچ بھی تمہارے ذمہ رہے گا، خریداروں کے گلے کا ڈیا جب لیکن شکایت مجھ تک نہ آنے پائے۔ اس مرحلے سے فراغت کرکے گھر واپس آیا تو کئی آدمیوں کو اپنا منتظر پایا۔ یہ لوگ دکانوں کے امیدوار تھے، جو کسی نہ کسی علت میں بے دخل کئے جا چکے تھے، ان کی معروضات سنیں اور امید افزا باتیں کہہ کر

نذرانہ کی معمولی رقومات قبول کیں۔ شام کو میزان لگائی تو حسب ذیل تھی: رشوت مال - نذرانہ ل ۵/ خیرات کی مد میں ہے۔ جملہ مالیہ ۵

۳ار مئی۔: ہیڈ کوارٹر کی دکان کا تصفیہ کل ہو ہی چکا تھا، اب دوسری بڑی دکانوں کا انتظام کرنا تھا۔ ابھی بہت سی دودھاری موٹی موٹی بھینسیں باقی تھیں، اُن کا بازہ بیٹا اور رہنا گستا تھا، دوچست چالاک سپاہیوں کو ساتھ لیا اور گھوڑے پر بیٹھ کر چل دیا، کل ۱۰ میل کی منزل تھی اثنائے راہ میں ایک شخص تیز تیز قدموں سے آتا دکھائی دیا، سپاہی وردی میں تھے اور میں خالص جنٹلمین، قانون کی پابندی محض کم درجہ ملازمین کے لئے ہوتی ہے، عہدیداروں کے لئے نہیں، اور مجھے یوں بھی نیلی پیلی وردی سے اُلجھن ہوتی ہے، جیسے ہی راہ گیر کی نظر سپاہیوں پر پڑی اس نے بے تحاشا بھاگنے کی کوشش کی۔ میں نے گھوڑا اُس کے پیچھے ڈال دیا اور سپاہیوں کو للکارا کہ پکڑو اس نابکار کو، ضرور اس کے پاس کوئی غیر قانونی چیز ہے، وہ کہاں تک بھاگتا، ایک کھیت کی مینڈ سے ٹھوکر کھا کر منہ کے بل گرا، میں نے اُس کا گریبان پکڑ کر پوچھا کیوں بھاگے تھے تم، کیا ہے تمہارے پاس؟ اُس نے کہا: کچھ نہیں حضور! آپ لوگوں سے خدا بچائے، اس سے پہلے جو انسپکٹر صاحب کرنجی آنکھوں، پھولے گالوں، بڑی مونچھوں اور گھٹے سر والے یہاں تھے اُنھوں نے اس طرح ایک مرتبہ راہ چلتے میری کمر سے ۲۰ تولہ افیون کی پوٹلی باندھ دی اور عدالت سے بے وجہ دو سو روپیہ نقد اور ۶ ماہ قید سخت کی سزا دلوادی، جب سے سرکار ہر کالے سر والے سے ڈر لگتا ہے، دودھ کا جلا مٹھا پھونک پھونک کر پیتا ہے، آپ کو دیکھ کر یہ اندیشہ ہوا کہ کہیں آپ بھی وہی پوٹلی والی حرکت نہ کریں۔ ارے ہاں کون بیٹھے بٹھائے چوٹ پر چوٹ کھائے!

بھگوڑے کی گفتگو سے مجھے افیون کی وہ پوٹلی یاد آگئی جو ایک دن پہلے ہیڈ کوارٹر کی دکان سے درحقیقت "داشتہ آید بکار" کے خیال سے فراہم کی تھی۔ معاً ذہن میں آیا کہ ترکیب تو اچھی بتائی، اس بھاگتے بھوت نے، کیوں نہ اس کی لنگوٹی سے فائدہ اُٹھایا جائے، کارگذاری ہوجائے گی، سزا یافتہ تو ہے ہی، عدالت آؤ دیکھے گی نہ تاؤ جھٹ سے سزا دیدے گی، چنانچہ اللہ کے بھروسے پر دو چار نام جلدی جلدی لے کر میں نے بھی وہی عمل کیا جو میرے پیش رو کرنجی آنکھوں والے انسپکٹر کر چکے تھے۔ ملزم بہت چیخا پیٹا، مگر "کون سنتا ہے فغانِ درویش" وہ کہیں سے اپنی ایک راس بھینس لے کر لوٹا تھا، اُس کی کمر میں ساڑھے تین سو روپے بندھے تھے، وہ اب اُس کی کمر کے بجائے میری جیب میں لنگر انداز تھے، میں نے سوچا غلیظ کھایا ہے تو آدھا پیٹ کیوں کھاؤں۔

۱۴ار مئی۔ ابھی ابھی عدالت سے واپس آیا ہوں، مقدمہ پوری طور پر کامیاب ہوا، چاروں طرف سے جکڑا ہی ایسا تھا کہ حاکم کو چون و چرا کا کوئی گوشہ خالی نہ ملا، ملزم نے صفائی دینے سے انکار کیا لہٰذا فیصلہ بھی

جٹ جنگ پٹ بیاہ کی طرح ہو گیا، غریب کو پورے ایک سال قیدِ بامشقت کی سزا دی گئی۔ کچھ نخک سا گیا تھا، سونے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ ننھے سپاہی میرے پاس آیا اور سرگوشی کے انداز میں کہنے لگا: ذرا سی ہمت کیجئے تو دو تین ہزار کی رقم چٹکیاں بجاتے مل سکتی ہے۔ میں نے کہا "اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔" اس نے کہا کہ اس قصبے میں سیٹھ رام چرن داس بھنگ کے بڑے شوقین ہیں، آپ اس وقت اُن سے ملنے چلئے اور تھوڑی سی بھنگ ساتھ لیتے چلئے۔ میں موقع پا کر اُن کے کمرے میں کسی کونے میں ڈال دوں گا، آپ برآمد کر لیجئے گا۔ ترکیب تیر بہدف تھی پھڑ پھڑا کر اُٹھ بیٹھا، کارِ خیر میں تعجیل بہتر ہوتی ہے بکس کھول کر دیکھا تو کوئی چالیس تولہ کے قریب چھینی چھینی جمع تھی۔ ایک تھیلی میں خوب داب داب کر بھروائی، اور ننھے سپاہی نے بغل میں داب کر اوپر سے کوٹ لٹکا لیا اور ہم رام چرن داس کے عالی شان محل کی طرف چل دئیے۔ کامیابی کے جو اتر منتر یاد تھے وہ راستے بھر پڑھتے گئے، وہاں پہنچے، اطلاع کرائی۔ سیٹھ صاحب صدر دروازے تک لینے کے لئے آئے، بہت تپاک و گرمجوشی سے ملے، فراخدلی کے ساتھ تواضع کی، ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد کہنے لگے: "اچھا ہوا آپ یہاں آگئے، جن کی جگہ پر آپ آئے ہیں وہ بڑے لالچی اور بہت بُرے آدمی تھے، رات دن اُنھیں چھل بٹا بازی کی دھن رہتی تھی، چال چلن کے بھی خراب تھے۔" میں نے کہا: "مگر سیٹھ صاحب اس وقت تو میں بھی کچھ اچھا آدمی بن کر نہیں آیا ہوں کیونکہ آپ کے مکان کی تلاشی کا ارادہ رکھتا ہوں۔ افسرانِ بالا کا حکم ہے، ٹال نہیں سکتا، کسی نے براہِ راست مخبری کی ہے کہ آپ کے مکان میں کوکین وغیرہ کا ناجائز ذخیرہ موجود ہے۔" اور یہ کہہ کر میں نے ادھر اُدھر نظریں دوڑانا شروع کر دیں، گویا تلاشی کا آغاز ہو گیا، ننھے سپاہی اپنا فرض ادا کر چکا تھا۔ اب میری باری تھی۔ بہت جلد سفرِ وضد اور منفصلہ تھیلی برآمد ہو گئی، اب تک تو سیٹھ صاحب اپنی فطرت کے خلاف کچھ دوں دبکے لگ رہے تھے، اب جو تھیلی میرے ہاتھ میں دیکھی تو مجسم بنیے بن گئے، دھوتی کی لپیٹ اپنی جگہ سے ہٹ گئی، ہونٹ تھرتھرانے لگے اور آنکھوں کی پتلیاں چرخے کی طرح گھومنے لگیں، ننھے سپاہی کا خیال ٹھیک نکلا صرف تین ہزار کی رقم پر توڑ ہوا اور تھیلی پھر بھی گھاٹے میں رہی۔ ایک ہزار کی رقم سپاہیوں میں بٹی اور باقی بحقِ سرکار بیت المال کی تجوری میں منتقل ہوئی۔

۵ رمئی: اُڑتی اُڑتی خبر ملی ہے کہ سیٹھ رام چرن مجھ سے مل کر بہت خوش ہوئے اور بکمالِ محبت مجھے "بھلا مانس" کا خطاب و اعزاز عطا کیا ہے۔ اُن کی اس شریفانہ عنایت کا کسی نہ کسی دن شکریہ ادا کرنا ہی پڑے گا، کیونکہ آدمی مردم شناس اور شریف پرور معلوم ہوتے ہیں۔ دن قدرے بے لطفی سے گزرا تھا، رات اُسی مناسبت سے بہت پُر کیف رہی، کیونکہ اتفاق سے بستر نرم بھی تھا اور گرم بھی، جی ہاں گرم بھی، "دستِ غیب" کی فراوانی میں تعمیر

اخراجات کی مدیں معطل و مفلوج رہیں تو "کفرانِ نعمت" کی حد قائم ہو جاتی ہے۔ آج تین چار دکانوں کے معائنے کا پروگرام تھا۔ روانگی پر پہلے اسٹور کیپر میرے پاس آئے، اور کہنے لگے: "آپ دورے پر جا رہے ہیں، کب تک پلٹیں گے؟" میں نے کہا: آج نہیں تو کل واپسی یقینی ہے۔ کہنے لگے: نہیں کل بھی نہ پلٹئے، میرا مطلب ہے کہ جلد سے جلد نہ یا زیادہ سے زیادہ دو دکانیں دیکھ آیئے۔ آپ کی شہرت کچھ اچھی نہیں ہو رہی ہے، معلوم نہیں کیا بات ہے، ابھی تو آپ نے کسی کا کچھ بگاڑا بھی نہیں ہے۔ ممکن ہے ہفتے عشرے کے اندر آپ پھر صدر دفتر میں طلب کر لئے جائیں، کوئی سی آئی ڈی کا آدمی آپ کے پیچھے لگا ہے۔" ذخیرہ دار کی بات سن کر دل زور زور سے دھڑکنے لگا، پھر بھی میں نے اپنے ہونٹوں پر جو شراب نوشی کی کثرت سے سفید ہو گئے تھے، حقارت آمیز مسکراہٹ پیدا کرتے ہوئے کہا: "ہش" کیا چاند ہو گانے کی خبر لائے ہو، مجھے کوئی ایسا ویسا سمجھا ہے "آزاد کہ حساب پاک است از محاسبہ چہ باک!" میں کسی سے نہیں ڈرتا۔

تم یہاں کتنے دنوں سے تعینات ہو؟ میں نے ذخیرہ دار سے سوال کیا۔ آٹھ دس سال سے۔ اُس نے جواب دیا۔

تب تو تم اپنے کام میں بڑے ہی پکے ہو گے، ماہوار کیا اوسط پڑتا ہوگا، میں نے رازدارانہ لب و لہجہ میں پوچھا۔

ایک پیسہ نہیں ملتا اوپر سے، اُس نے باطمینان سر ہلا کر کہا۔

غلط کہتے ہو تم، سچ سچ بتا دو ورنہ پچھتاؤ گے۔

کیا نشہ میں ہیں آپ انسپکٹر صاحب! میں ذخیرہ دار ہوں، انسپکٹر (ناظر) نہیں، مجھے کیوں کوئی نذر بھی دینے لگا۔ اچھا یہ بات ہے تو دورہ ملتوی، چلو لگے ہاتھ ذخیرے ہی کا معائنہ کر ڈالوں۔ ذخیرہ دار کا چہرہ اس طرح خشک دکھائی دینے لگا، جیسے صدیوں کا بیمار ہو۔

اسٹور کا معائنہ شروع ہوا، موجودات کی مقدار میں نمایاں کمی پائی گئی، جس سے غبن اور ناجائز تصرف کا الزام آفتاب کی طرح جگمگانے لگا۔ اسٹور کیپر اس طرح چپ تھا، جیسے سانپ سونگھ گیا ہو، کوئی معقول جواب نہ دے سکا، میں نے نمبے سپاہی سے کہا: قفل پر اپنی سیل کر دو، اور تار کے ذریعہ اکسائز کمشنر (افسر مسکرات) کو اس واقعے کی اطلاع دے دو۔ اس کارروائی کے بعد ہم مکان واپس آ گئے۔ ابھی ہم لوگوں کو آئے ہوئے کوئی دس ہی منٹ ہوئے ہوں گے کہ ذخیرے دار صاحب جو اپنے آپ کو بہت بڑا گھاگ اور گرگ باراں دیدہ سمجھتے تھے اور مجھے دھمکانے آئے تھے لڑکھڑاتے آتے دکھائی دیئے، آتے ہی زار و قطار رونے لگے۔ میں نے کہا: ارے بھئی یہ کیا! کہنے لگے سرکار مر جاؤں گا بال بچے دار آدمی ہوں، بین ڈھور کر جو کچھ رکھا تھا حاضر ہے، اب عزت آپ کے ہاتھ ہے۔ ان کی گریہ وزاری پر مجھے ترس آ گیا اور کیوں نہ آتا، نیت میں کوئی فتور اور دل میں کھوٹ تو تھی ہی نہیں۔

صرف اپنا سکہ بٹھانا اور اپنی دھاک باندھنی تھی، سو وہ بندھ گئی۔ سپاہی سے اشارہ کیا کہ جاؤ بھئی اپنی سیل توڑ دو، اور ذخیرے سوا۔ کو آئندہ محتاط رہنے کی ہدایت کر دو۔ ان لوگوں کے چلے جانے کے بعد تھیلی سے روپے نکال کر گنے تو پورے پانچ سو تھے، وہ بھی چاندی کے۔ باچھیں کھل گئیں کہ صبح ہی صبح اچھا شگون ہوا، ہڑ لگا نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا۔ غریب اسٹور کیپر کا دراصل کوئی قصور نہ تھا، وزن و نقد اور میں اختلاف اور کمی محض نتھے سپاہی کی تیزدستی کے کرشمے تھے، حقیقت برائے نام بھی نہ تھی۔ لیکن میں کیا کر سکتا تھا، ضابطے سے مجبور تھا، مجھے تو بہرحال اعداد و شمار غیر قانونی بتائے گئے، اس پر نوٹس لینا میرا منصبی فرض تھا، اس کو نظرانداز کر کے نمک حرامی کا مرتکب کیوں بنتا۔

۶ رمئی: ابھی ناشتہ کے لئے آلتی پالتی مار کے بیٹھا ہی تھا کہ کرم علی سپاہی اپنے حلقے کا گشت کر کے واپس آیا، ہشاش بشاش، ایک طشتری میں دو سو کے نوٹ آگے رکھ دیے۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ ذات شریف نے کسی بد دماغ اور سڑی طبیعت کو بیٹے پر دک بنانے کا کچھ سامان رکھوا کر پانچ سو کی رقم اس سے اینٹھی ہے۔ یہ بی صاحبہ بڑی ہی کالا آتش ہیں، اپنے آپ کو حسن و جمال کا مجسمہ اور ناز و انداز کا پیکر سمجھتی ہیں، پولیس کے سب انسپکٹر کی منظور نظر ہیں، اس لئے دماغ آسمان پر ہے، کسی سے سیدھے منہ بات نہیں کرتیں تو یہ کہو کہ بڑی حرافہ کو رام کیا ہے، بس یہی دو سو کی رقم یا اور بھی کچھ؟ کل سے دورہ شروع کرنا ہے، کرم علی نے مسکرا کر کہا: بھلا یہ بھی کوئی بات ہے، حضور کے اقبال سے ایک چھوڑ دو دو، ایک سے ایک اپ ٹو ڈیٹ، اور سیو لی فل، کمسن، گل اندام، پری چہرہ، آہو چشم، کبک رفتار، آشوب روزگار، اور طرہ یہ کہ کم خرچ، بلند معیار، اس خردہ دل بہار نے رگ رگ میں اک قیامت سی برپا کر دی۔ دن بڑی بے چینی اور کرب سے گذرا، شام ہوتے ہی حسن و شباب کے دو نازک ترین منھ بولتے مجسمے نشۂ جوانی میں سرشار، اپنے نقرئی قہقہوں اور برق پاش مسکراہٹوں کی دل آویزیوں سے گلستاں بہ کنار، اپنی تمام تر نسوانی رعنائیوں اور سبک نزاکتوں کے ساتھ میخانہ بدوش اور ساغر بکف میرے مشتعل جذبات اور تلاطم انگیز خیالات کی ہم آہنگی و پذیرائی کے لئے محو انتظار تھے۔ رات جس لطف و مسرت سے کٹی وہ صرف محسوس کرنے کی چیز ہے، بیان کرنے کی نہیں!

۷ رمئی: آج اتوار ہے، ملازموں کے لئے یہ دن چین کی بنسی بجانے کے لئے اور ہفتہ بھر کا کسل و تکدر رفع کرنے کے لئے مقرر ہے، میں بھی اس سے مستفید ہو رہا ہوں۔ عیش و عشرت میں چولی دامن کا ساتھ ہے، عیش کی یہ پوری رات بدمستیوں اور نفس پرستیوں میں گزار دی اور اب یہ سوچ رہا ہوں کہ سب انسپکٹر

پولس کی مخالفت کے ساتھ ساتھ ایک ہزار کی رقم جیب سے نکل گئی، پھر اس سب کے نتیجے میں معلّی یا برخاستگی گھاتے میں اگر جب ہوگی تب ہوگی، "دیدہ خواہد شد"

کچھ دیر اور چہچہے لوں میں نغمۂ حیات   بجلی ابھی تو میرے نشیمن سے دور ہے

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

اردو کی تعلیمی اور ادبی تحریکوں کا مرکز

اردو کے سلسلہ میں بمبئی شہر اور صوبہ کو جو اہمیت حاصل ہے اُس کا تقاضا ہے کہ یہاں ایک ایسا مرکزی ادارہ قائم کیا جائے جو اردو سے متعلق ہر قسم کی تحریکوں اور کاموں کا مرکز ہو، چنانچہ تقریباً سات سال سے اس سلسلہ میں کوشش کی جا رہی تھی اور خوشی کی بات ہے کہ اب یہ کوشش کامیاب ہو گئی ہے ۔ ——— یہاں کی حکومت نے دوسری تین زبانوں مرہٹی، گجراتی اور کنیڑی میں سے ہر ایک کو اسی قسم کے مرکز کے قیام کے لئے بارہ ہزار روپے کی رقم دینا منظور کیا تھا۔ انجمن اسلام اردو زبان کے لئے بھی اسی قسم کی مراعات کی طالب تھی، اگرچہ اس نے اپنی طرف سے ادارہ کے لئے عمارت، کریمی لائبریری کا ذخیرہ اور دفتری اخراجات کی ذمہ داری لی تھی لیکن علمی، تعلیمی اور ادبی کاموں کے لئے اتنا ہی کافی نہیں تھا بلکہ اساتذہ اور رفقاء کی تنخواہوں وغیرہ کے لئے مستقل سرکاری امداد ضروری تھی۔ اس سال سے حکومت نے انجمن کو دس ہزار روپے سالانہ کی مستقل رقم چند شرطوں کے ساتھ دینا منظور کر لیا ہے اور انجمن نے کسی تاخیر کے بغیر اس کام کو شروع کر دیا ہے، چنانچہ اس وقت مندرجۂ ذیل کام ادارے کے پیش نظر ہیں :—

(۱) اردو پوسٹ گریجویٹ تعلیم ——— اس سلسلہ میں یونیورسٹی کو درخواست بھیجی گئی ہے ——— انشاء اللہ یونیورسٹی بہت جلد اس ادارے کو اس کام کے لئے منظور کر لے گی اور جون سے ایم۔ اے، کی باقاعدہ تعلیم شروع ہو جائے گی۔ (۲) ریسرچ ایم۔ اے، کے بعد ڈاکٹریٹ کے لئے کام کرنے والوں کی ہدایت۔ (۳) علمی کام کرنے والوں کی حتی الامکان ادبی امداد۔ (۴) اردو کے ایک مکمل کتب خانے کا قیام۔ (۵) ایک خالص علمی رسالہ کا اجراء۔ (۶) مختلف یونیورسٹیوں میں اردو ادب پر کام کرنے والوں سے متعلق معلومات کی فراہمی۔ (۷) کریمی لائبریری اور کتب خانہ جامع مسجد کی کتابوں کی مفصل فہرست کی ترتیب۔ (۸) اردو کی قلمی اور نایاب کتابوں کا حصول اور ان کی صحیح اشاعت ——— وقت کے ساتھ ہی ساتھ ہمارا کام بھی انشاء اللہ بڑھتا جائیگا۔ اس وقت ادارہ میں ایک ناظم (ڈائرکٹر) ایک نائب ناظم (اسسٹنٹ ڈائرکٹر) اور ایک رفیق (فیلو) کام کریگے

اس سلسلہ میں تمام خط و کتابت مندرجۂ ذیل پتہ پر کی جائے :

پتہ :- آنریری ڈائرکٹر انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ۹۲ ہارن بائی روڈ بمبئی ۱

تو

تصوّف اور اقبال

امیر محمد - بی، اے

یہ بات سب جانتے ہیں کہ اردو شاعری کی داغ بیل صوفیائے کرام کے ہاتھوں پڑی اور انہیں بزرگوں نے اس نونہال کو پروان چڑھایا۔ ایران نے ہندوستان سے تصوف کا جو درس لیا وہ وہاں کی شاعری کی رگ و پے میں خوب رچا اور رَچ کر اس کا ایک مزاج سا بن گیا۔ یہاں تک کہ صوفی اور شاعر دونوں ہم معنی ہو گئے۔ فارسی شاعری سے ہماری اردو شاعری میں بھی یہ چیز منتقل ہو آئی اور اس کا سارا سرمایۂ حیات، تصوف ٹھہرا۔ اِس سرمایہ نے نئی قدروں کے ساتھ ابتدا میں وہ جوہر دکھائے کہ پرکھنے والے عش عش کرتے ہیں۔ صوفیاء نے وہ وہ خاموش تعمیری (لِسانی اور سماجی) خدمات انجام دیں کہ آج بڑے سے بڑے سرمایہ سے بھی کوئی تبلیغی ادارہ نہیں دے سکتا۔ ان کی بے نفسی، محبت فاتحِ عالم، اور یقین محکم نے شہنشاہوں کو لرزا دیا۔ کیوں نہ لرزاتے؟ ان کو سرزمینوں کی خلافتیں جو عطا ہوئی تھیں۔ باقاعدہ ارشادات ہوتے تھے اور حلقۂ اثر کی تقسیم ہوتی تھی۔ غرض ان کا ایک اچھا خاصا نظامِ کلیسائی قائم تھا۔ لیکن یورپ کے پاپاؤں کی طرح انھیں کبھی سیاسی اقتدار حاصل کرنے کی آرزو نہ تھی۔ اور نہ وہ ان کی طرح رجعت پسند ہی تھے۔ ان کی قدریں دوسری تھیں۔ بے باکی، شانِ استغنا، خلوص اور ایثار یہ سب کچھ ان ہی کی بدولت حاصل تھا۔ تصوف کو وہ زندگی کی تجدید کہتے تھے۔ اسی لئے یہ ہندی نژاد پودا قیامِ عجم کے بعد اپنے وطن واپس آکر خوب پھلا پھولا۔ اگر اس میں اثباتی خوبیاں نہ ہوتیں تو وہ کبھی بارآور نہ ہوتا۔

صوفیائے نے شاعری کا دامن اس لئے پکڑا تھا کہ انھیں یہاں اپنی بساط بچھانی تھی۔ چنانچہ سرپھرے پیدا کرنے کی غرض سے انہوں نے رندوں کی خانقاہی محفلیں جمائیں، جہاں دعوتِ عام ہوئی۔ ہر کس و ناکس ان میں شریک ہوتا۔ وہاں ان کے فرسودہ عقیدوں اور روایتوں کے بھوت بھاگتے۔ الفاظ کے پرانے جال اور گورکھ دھندوں کی حقیقت سب پر روشن ہوئی اور لوگ اپنے خدا سے جمالیاتی ذوق کیساتھ عشق کر سکتے تھے۔ اس تصوفانہ جمال نے برسوں کے خشک زاہدانہ اور زولیانہ جمود کو توڑا۔ اگر صوفیاء ایسا نہ کرتے تو ہمارے مزاج اور ادب و فن میں تخلیقی راہیں پیدا نہ ہوتیں۔ انہوں نے آدم کی سرکشی اور شوریدہ سری کو خوب پرکھا اور نہی عنِ المنکر اور امر بالمعروف والے غیر نفسیاتی تانے بانے توڑ دئے۔ شراب انہوں نے اس لئے پی اور پلائی کہ لوگوں میں اخلاقی جرأت پیدا ہو

جراُت بھی کسی خراب کام کے لئے نہیں بلکہ اپنے محبوب حقیقی سے ملنے کے لئے۔ جب مقصد میں اتنی پاکیزگی ہو تو بھلا شراب کی خباثت کب قائم رہ سکتی تھی۔ صوفیا اسے نشاط کی غرض سے نہیں پیا کرتے تھے، بلکہ ایک کیف پیدا کرنے کے لئے پیا کرتے تھے۔ شراب ان کی روحانی قوت کی لونڈی بنی رہتی تھی۔ غرض مشائخ کے حلقے اُس زمانے کے اچھے خاصے ترقی پسند ادارے تھے، جہاں نئی طرح پر بندوں کو اپنے خدا سے ملنے کی تعلیم دی جاتی تھی۔ لوگوں کو پُرانی ڈگر سے ہٹایا جاتا اور ان کے جمود میں نئی حرکت پیدا کی جاتی۔ اس زمانے کا صوفی بقول اقبال "خدمتِ حق میں مرد، محبت میں یکتا اور حمیت میں فرد تھا، وہ قم باذن اللہ کہہ سکتا تھا اس لئے کہ اس کا ضمیر روشن اور اُس کی نظر میں فیض ہوتا تھا۔ خانقاہ اسی فیضانِ نظر کی وجہ سے مکتب پر بازی لے گئی اور ملّا و مفتی کی ایک نہ چلی۔ صوفیا بزرگ تو شہنشاہوں کو اپنا ہمسر کہتے تھے۔ وہ بھلا کب کسی دوسرے کی پرواکرتے۔ وہ وجدان اور عرفان دونوں کے مالک تھے۔ علما ان دونوں باتوں سے محروم رہا اور عرفان تو شہنشاہوں کو بھی نصیب نہ ہو سکا۔ صوفیا کو یہ سعادت نصیب ہوئی تھی شاعری کی وجہ سے۔

صوفیا کے بعد شعرا کی باری آئی۔ یہ میں بتا چکا ہوں کہ تصوف فارسی شاعری کی گھٹی میں پڑ گیا تھا اور اس کی ساری نشو و نما تصوفانہ ماحول میں ہوئی تھی۔ یہی حال اردو شاعری کا رہا۔ اس کا سارا خمیر فارسی شاعری سے تیار ہوا۔ اور وہ اُسی کے نقشِ قدم پر چلی۔ چنانچہ اردو شعرا کا مشرب بھی تصوف ہی رہا، لیکن ان میں صوفیا کی سی شانِ استغنا نہ رہی، اس لئے کہ وہ پیشہ ور ہو گئے۔ صوفیا اس معاملہ میں خوش قسمت تھے۔ وہ شاعری سے دوسرے، سماجی خدمت لیتے تھے۔ اس میں ان کی کوئی ذاتی غرض شامل نہ تھی۔ ان کا اپنے خدا سے براہِ راست تعلق ہوتا تھا۔ ان کے خانقاہی درباروں میں سب لوگ اپنی انفرادیت بھلانے کی کوشش کرنے اور کائنات میں امتزاج محسوس کرنے کی کیفیت طاری ہونے دیتے تھے۔ اس کے برعکس شاہی درباروں میں سیاسی شوکت مسلط رہتی۔ وہاں انفرادیت ہاتھ سے جانے نہ پاتی۔ بیچارے پیشہ ور شعرا کو ان درباروں کے سیاسی خداؤں کی مدح میں قصیدہ خوانی کرنی پڑتی۔ شاعری کو انہوں نے ذریعہ معاش بنا کر اپنی اور فن کی قدر گھٹا دی۔ ان کے کلام میں ابتذال آ گیا۔ جب مقصد میں بلندی نہ ہو تو ذہنی پستی لازمی ہے۔ اسی لئے بیچارے شعرا سے یہ نہ ہو سکا کہ وہ اُس زمانے کی پست بد مذاقی کا ساتھ نہ دیتے اور اپنے ماحول سے بلند ہوتے۔ تصوف کی بدولت وہ مینا و ساغر کی بات ضرور دہراتے رہے، جس سے مُلّا جز بز ہوتے تھے۔ لیکن تصوف کا علمی پہلو اب تاریک ہو گیا تھا۔

جب مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کا شکر ٹوٹا تو ساری کایا پلٹ ہوگئی۔ پرانی بساط کے سارے مہرے منتشر ہوگئے مغربی تہذیب نے نئے زمانے کی مُرلی بجائی اور جو اس سے جاگے انہوں نے ترقی کی نئی شاہراہیں لیں۔ خانقاہوں میں پہلے سے مردِ قلندر نہ تھے۔ ان کے ہمسر بادشاہ مسٹ چکے تھے۔ اب کوئی مدِمقابل نہ تھا۔ اگلوں کے فرسودہ سماجی نظام کی جتنی خرابیاں دور ہوسکیں وہ انہوں نے کیں۔ وہ اپنا کام بحسن وخوبی انجام دے چکے تھے۔ یہی اُن کا حصہ تھا۔ اب ان کی کوئی اہمیت نہ تھی مغرب سے علوم وفنون کے دریا بہنے لگے تھے۔ زندگی کے مختلف مسائل اور شعبوں کی ہما ہمی میں لوگ پچھلی باتیں بھول چکے تھے۔ نظریے بدل رہے تھے۔ غیروں کی سیاست کا جال بچھ رہا تھا۔ چنانچہ داخلیت، غیروں کے سایہ میں اُسی طمطراق کے ساتھ قائم نہیں رہ سکی۔ شعراء بوکھلا گئے۔ ان کے داخلیت سے بھرے ہوئے شوخ اور رنگین کلام کی قدر اب کون کرتا؟ وہ مدح بھی کرتے تو کس کی؟ سارا مذاق بدل چکا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ کس مپرسی کی حالت میں پڑ گئے۔ جن چند شعراء کو اس کس مپرسی کا احساس ہوا انہوں نے اس حرماں نصیب زندگی کا رونا رویا اور اتنے مؤثر انداز میں کہ پتھر کا دل بھی پگھل کر موم ہوجائے۔ ان کا قنوطی کلام، حسرت، یاس اور درد سے بھرے ہوئے دل کی بہترین داستان ہے۔ میر اور غالب نے اردو شاعری کو جو فنی شاہکار بخشے ہیں وہ غیر فانی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے وہ کسی اندرونی درد وکرب میں مبتلا ہیں، یہاں تک کہ اُن کی عزیز چیز تصوف کا دامن بھی ان کے ہاتھوں سے چھوٹا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ غالب کا شعر ملاحظہ ہو ؎

اصلِ شہود وشاہد ومشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

دوسرے مصرعہ سے غالب کا شبہ ظاہر ہوتا ہے۔ شاعر کی تخلیقی قوت اور نکتہ رس نگاہ سے تصوف کی کمزوری چھپ نہ سکی۔ زمانہ جو بات اس کی زبان سے کہلوانا چاہتا تھا وہ اُس نے کہدی۔ بغرض شعراء کا تصوف بھی خطرہ میں پڑ چکا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ مسلم قوم کے تنِ لاغر سے جان نکل رہی تھی۔ سب کے حوصلے پست ہو چکے تھے۔ کوئی مقصد پیشِ نظر نہ تھا۔ سب کی زبان پر ستمہائے روزگار کی شکایت تھی۔

اس جمود اور پستی کے عالم میں مغربی تہذیب کے دھارے نے، جس کا میں اوپر ذکر کر آیا ہوں، ایک تلاطم بپا کیا۔ اس سے ایک گوہر کی سیرابی ہوئی اور صحیح معنوں میں اس طوفانِ مغرب نے مسلمانوں کو مسلمان کردیا۔ ایک دیو پیکر ہستی نمودار ہوئی، جس نے مغربی علوم وفنون اور نئے تمدن کے دریاؤں کو بہنے کا راستہ دیا اور ملّا کے مکتب پر ایک ضربِ کاری لگائی۔ تعلیم کے ذریعہ اس نے روشن خیالی پیدا کی۔ ادب وفن کو نئے رجحانات بخشے لوگوں کو غفلت کی نیند سے چونکایا۔ انھیں داخلیت سے نکل کر خارجیت کی طرف آنے کی دعوت دی۔ سرسید نے

صوفیانے کندھوں کو ہلکا کر دیا۔ اب ملّا ان کے مدِمقابل آگئے۔

لیکن چونکہ تصوف کا شکر شاعری کی رگ رگ و پے میں سما گیا تھا اس لئے ہماری انفرادیت خطرہ میں تھی۔ ضرورت تھی کہ ہمارے اس نقدِ حیات کو بچانے کے لئے ایک شخص پیدا ہو۔ چنانچہ ایک مردِ قلندر اٹھا اس نے اس کام کا بیڑا اٹھایا اور تصوف کے خلاف آواز بلند کی۔ اُس کی بالغ نظر نے تصوف کی تہی دامنی کے مضر اثرات کی طرف لوگوں کو متوجہ کیا۔ اُس نے مغرب کے نظریات کا خوب مطالعہ کیا تھا، چنانچہ اقبال نے بتایا کہ مسلمان کی انفرادیت میں تصوف کا گھن لگ گیا ہے۔ وہ اخلاقی اور سماجی پابندیوں سے آزاد ہو تا جا رہا ہے اور رہبانیت اسے سماج کا ایک عضوِ معطل بنائے جا رہی ہے۔ اقبال نے زندگی کی تجدید کی اور اردو شاعری میں ایک نیا باب کھولا۔ اس نے خودی کا ایک تصور قائم کیا۔ وہ ساقی نامہ میں لکھتا ہے ؎

یہ موجِ نفس کیا ہے؟ تلوار ہے	خودی کیا ہے؟ تلوار کی دھار ہے
خودی کیا ہے؟ رازِ درونِ حیات	خودی کیا ہے؟ بیدارئ کائنات
ازل اس کے پیچھے ابد سامنے	نہ حد اس کے پیچھے، نہ حد سامنے

اسی سے آگے ایک جگہ وہ شہود و شاہد و مشہود کی تثلیث کا نقش مٹا کر خودی کی توحید کا نقش قائم کرتا ہے ؎

تری آگ اس خاکداں سے نہیں	جہاں تجھ سے ہے تو جہاں سے نہیں
بڑھے جا یہ کوہِ گراں توڑ کر	طلسمِ زمان و مکاں توڑ کر
خودی شیرِ مولا، جہاں اس کا صید	زمیں اس کی صید آسماں اس کا صید
جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود	کہ خالی نہیں ہے ضمیرِ وجود
ہر اک منتظر تیری یلغار کا	تری شوخیٔ فکر و کردار کا
یہ ہے مقصد گردشِ روزگار	کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار

غرض جب اقبال نے خودی کے اس تصور کی ضربِ کلیمی لگائی تو صوفی اور اس کا ہم مشرب شاعر، دونوں چونک گئے۔ دونوں نے مل کر ایک محاذ بنایا۔ اکبر الہ آبادی مرحوم اور خواجہ حسن نظامی نے فلسفی شاعر سے سلسلۂ بحث قائم کیا۔ خوب گرما گرم بحث ہوئی۔ دونوں نے اقبال کو مشورہ دیا کہ وہ اپنا رویہ بدل دیں اور تصوف پر چوٹیں کم کریں۔ لیکن بلند فکر اور پاکباز شاعر، اپنے مقصد سے کب باز آ سکتا تھا۔ سر سید نے مُلّا کے کفر کو توڑا تھا تو اقبال نے صوفی اور شاعر کے خدائی کدو کو توڑ دیا ہے ⁂

از ادارہ

اس دورِ مسلسل میں جبکہ ہندوستان ترقی کے راستہ پر گامزن ہے۔ روز افزوں نئی تبدیلیاں آنے والے واقعات کی غماری کر رہی ہیں۔۔ برسوں کی غلامی آزادی میں تبدیل ہو رہی ہے۔ جیل کے باغی نظامِ حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لئے ہوئے ہیں۔ خیال ہوتا ہے کہ آئندہ نغمات خوش آئند ہوں گے ـــــ ہر ملک جب ترقی کی طرف قدم بڑھاتا ہے، کچھ نہ کچھ انوکھے واقعات ضرور ملک میں ہوتے ہیں۔ ـــــ ایشیا رنگ کانفرنس کا انعقاد۔ متحدہ اسلامی تحریکوں کا احیاء، مصر و فلسطین کی بیداری۔ انڈونیشیا میں جدید جمہوریہ کا قیام۔ ویٹ نام میں تحریکِ آزادی۔ برما کا غلامی سے چھٹکارا۔ ہند چینی میں پھسر یہ ہی یہ اس دور کے عظیم الشان واقعات ہیں۔ ان واقعات کے ساتھ علم و عمل کی شمع جو غلامی سے ماند ہو گئی تھی۔ اس نے بھی اپنا رخ بدلا۔ آج ادب کی شاہراہ پر جو ترقی دیکھ رہے ہو یہ سب انہی حالات کی پیداوار ہے۔

تعمیر انہی حالات میں جلوہ گر ہوا۔ ہندوستان میں (قلبِ ہند جسے ہم وسطِ ہند کہتے ہیں) جو قرونِ سابقہ میں علم و عمل کا گہوارہ تھا یہاں سے ہندوستان کے بڑے بڑے رہنما۔ اور دوران۔ عالمِ دین متین اور فضلا پیدا ہوئے تھے۔ اس دورِ غلامی میں ہر طرف تاریکی کے بادل چھا گئے تھے۔ اور علم و عمل کا مرکز ختم ہو رہا تھا اسی صورت میں ہمیں ضرورت ہوئی کہ ہم وسطِ ہند کو منتخب کرتے ہوئے تحریک کا مرکز بنائیں اور ایسے وقت پر ہم کو ایک سرپرست کی بھی ضرورت تھی۔ جو علم و عمل میں ممتاز روزگار اور ادب و دیگر فنون کا شہسوار ہو۔ علامہ محوی قبلہ مدظلہٗ جن سے جنوبی ہند سیراب ہو رہا تھا۔ موصوف مدراس یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر کی حیثیت سے علم و ادب کی خدمات انجام دے رہے تھے۔ ہم نے صاحبِ موصوف کو مجبور کیا کہ وہ قلبِ ہند کو اپنا مرکز بنا کر عملی رہنمائی فرمائیں۔

موصوف نے ذاتی مصروفیتوں سے عزیز وقت نکال کر سرپرستی قبول فرمائی۔ ادارۂ تعمیر موصوف کا ممنون ہے کہ صاحبِ معز کی رہنمائی ہمارے لئے دو آتشہ ہوگی۔ ہم درجہ بدرجہ ترقی کرتے ہوئے یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ "تعمیر" جس خدمت اور جس تحریک کو سامنے رکھ کر نکالا جا رہا ہے۔ اس میں وہ کامیاب ہے

ہم قارئینِ "تعمیر" کو ایک اور خوشخبری سناتے ہیں کہ ادارۂ تعمیر ایک ہفت روزہ "خیال" جلد آپ کے سامنے پیش کرے گا۔ جس کو دیکھنے کے بعد ہمارے عزائم اور ہمارے مقاصد کا پتہ چل سکیگا۔ اگر آپ لوگوں کی ہمت افزائی جاری رہی تو آپ یقیناً "تعمیر اور خیال" کو معیاری ماہنامہ اور ہفت روزہ پائینگے۔

تعمیرلو

ہندوستان میں مختلف مجلس مصنفین اپنا کام کر رہی ہیں۔ تعمیری زندگی میں ہم نے جو معیار آپ کے سامنے پیش کیا ہے اس میں ادب ہند کے لئے ایک انقلابی لائحۂ عمل موجود ہے۔

۱۔ بہترین کتب کی طباعت و اشاعت
۲۔ معیاری کتب خانہ (بک ڈپو) کا اجرا
۳۔ تصنیف و تالیف و ترجمہ کا بہترین انتظام
۴۔ سنجیدہ رسائل و اخبارات کا اجرا

جس جس طرح ہمیں آسانیاں بہم پہنچیں گی ہم اپنے انقلابی کام کو عملی شکل دیتے رہیں گے۔ لیکن یہ آپ جانتے ہیں کہ کوئی کام اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کے سرپرست۔ معاون اور ہمدرد نہ ہوں ـــــــ ٹھوس کام اسی وقت ممکن ہے جبکہ آپ ہمارا ہاتھ بٹائیں۔ اور ضرورت کو ضرورت محسوس فرماتے ہوئے۔ دامے، درمے، قلمے، سخنے۔ امداد فرمائیں۔

کوئی ملک اور کوئی قوم اور کوئی ادارہ اس وقت تک ترقی نہیں پا سکتا۔ جب تک کہ اس کے افراد قوم اعیان، سرمایہ دار طبقہ پشتی بانی۔ امداد۔ اور سرپرستی نہیں کرتا۔

ہمیں یہ کہنے کا موقع دیجئے کہ ہمارا سرمایہ دار طبقہ اور اصحاب علم و فن ابھی تک اس طرف سے پہلوتہی کرتے ہوئے قوم کی تعمیری سرگرمیوں سے غفلت برت رہے ہیں۔ اب جبکہ ہندوستان نئی زندگی میں قدم رکھ رہا ہے اور ہر قوم اپنی آئندہ زندگی کے لئے برتری کی کوشش کر رہی ہے ـــــ آپ غافل ہیں ـــــــ دوسری قومیں اپنے بہار آفریں پیام سے آشنا ہوتی جا رہی ہیں مگر بقول حالی مرحوم:

"پر اس قوم غافل کی غفلت وہی ہے"

اسلام دنیا کے لئے مکمل اور جامع پیام ہے۔ "الحکمۃ ضالۃ المومن" آپ کی زندگی کا ایک بنیادی پہلو ہے کبھی آپ نے سوچا بھی کہ قلب ہند میں آپ کی حالت کس کسمپرسی میں ہے۔ قوم کا زاویۂ نگاہ کتنا نادُرست ہوتا جاتا ہے۔ اور اس کے تمام تر ذمہ دار قوم کے وہ افراد ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے استطاعت دی ہے لیکن وہ قوم کے معاملہ میں بے پروا ہیں وقت کا تقاضا پکار پکار کر بتا رہا ہے کہ ـــــــ جو سویا وہ کھویا۔ اور جو جاگا سو پایا!

اب دیکھیں کہ اس پکار پر کتنے کان دھرنے والے سامنے آتے ہیں ؎

سونے والے اُٹھ کہ ساقی کی صلائے عام ہے
جو یہاں ہشیار ہے، وہ مستحقِ جام ہے

(محوی لکھنوی)

تعمیر کے سلسلے میں جو آرا موصول ہوئیں، وہ اس کی قبولیت کی ضمانت ہیں۔ ادارہ اس ادب نوازی کا ممنون ہے
تعمیر کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ ایسے اصحاب کو ڈھونڈھ کر پیش کر رہا ہے جو ابھی حجابات میں ہیں اور منظر عام پر آنہیں
سکے ہیں ـــــ ہندوستان میں بہترین ادیب موجود ہیں۔ لیکن وہ گمنامی میں ہیں۔ ہم ایسے حضرات سے متدعی
ہیں کہ ان کے لئے تعمیر کے صفحات موجود ہیں۔ اب زمانہ آپ کو یاد کر رہا ہے۔ آپ کب تک خاموشی اختیار کئے
رہیں گے ـــــ زمانہ کے ساتھ چلئے۔ اور اپنے قیمتی افکار سے ملک و قوم کی رہبری کیجئے۔ افراد قوم کی تمنائیں
آپ سے وابستہ ہیں علم کے خزانے کو کیا آپ اپنے ساتھ لیجائیں گے ؟ ہندوستان کے نہ معلوم کتنے گنجینے
ختم ہو گئے۔ وقت کی آواز آپ کو بلا رہی ہے ؎

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندستان والو
تمھاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں
(اقبال)

تمہیں دیکھنے کے بعد جانے عقل و ہوش کیا ہو گئے کہ اس سے محبت کی جاتی رہی ۔ تمہارے ہی کالج میں وہ پڑھتا تھا، شاید تم جانتی بھی ہو، اس کا نام ہے سعید، بورڈنگ میں رہا کرتا تھا ۔ تمہارے والدین نے شادی کے لئے جائداد کی شرط رکھی، اور میں نے نہ صرف اس کی جائداد پر قبضہ کر لیا تاکہ اپنی جائداد زیادہ بتا سکوں

نجمہ ۔ ہیں یہ کیا، تم تو کہتے تھے کہ اس نے ایک طوائف محبوب نامی سے تعلقات پیدا کر لئے تھے اور اس پر اپنی دولت لٹا رہا تھا اس لئے تم نے تمام جائداد محفوظ کر لی ۔

رشید ۔ کیا بتاؤں نجمہ، یہ بات نہیں ۔ میں نے صرف جائداد پر قبضہ کرنے کے لئے یہ الزام اس بے چارے پر لگا دیا تھا ۔ اور جائداد بھی مل گئی، شادی بھی تم سے ہو گئی، لیکن تمہاری محبت نہ مل سکی ۔ میں نے تصورات میں جو محل تعمیر کئے تھے، وہ گرتے ہی رہے آخر ......

نجمہ ۔ (تعجب سے) آپ نے میرے لئے اپنے بھائی پر بھی ظلم کیا، کیا آپ کی یہ خود غرضی نہ تھی ۔

رشید ۔ ہاں تھی تو مگر تمہیں حاصل کرنے کا اس کے سوا چارہ بھی نہ تھا ۔ اب میری آنکھیں کھلی ہیں ۔ دنیا یہی کہے گی کہ میں نے اپنے سوتیلے بھائی کا حق چھین لیا، دنیا میرے اوپر لعنت بھیجے گی ۔ میں لاجواب ہوں دنیا کے سامنے سر اٹھانے کے قابل نہیں ۔

نجمہ ۔ لیکن وہ تو ایک عرصے سے غائب ہیں ۔

سعید ۔ میں نے ہی لکھ دیا تھا "تم صورت نہ بتانا" وغیرہ وغیرہ ۔ اور تم سے اپنی شادی کا بھی حال لکھ دیا تھا وہ اسی وقت سے لاپتہ ہے مگر اب اس کی یاد رہ رہ کر آتی ہے ۔ (خاموشی)

(باہر سے آہستہ آہستہ قدموں کی آواز آتی ہے اور قاسم کی کانپتی ہوئی آواز سنائی دیتی ہے)

قاسم ۔ سرکار! ادھر آ جائیے، اندر چلے آئیے ۔ بجلی کس زور کی چمک رہی ہے!

رشید ۔ یہ قاسم کسے سرکار پکار رہا ہے؟ (دروازہ کھولتا ہے)

نجمہ ۔ میں بھی ساتھ آتی ہوں اکیلے نہ جائیے ۔

(اتنے میں پستول کے چلنے کی آواز آتی ہے یہ لوگ دوڑ جاتے ہیں)

رشید ۔ ارے یہ تو میرا پیارا بھائی ہے ۔ سعید، سعید یہ کیا کیا تم نے؟ کیا میری باتیں سن لیں؟

سعید ۔ (کراہتے ہوئے) میرے پیارے بھائی ...... بھیا میرے بھی ۔ یا ۔ (ہچکی آتی ہے)

نجمہ ۔ (بھرائی ہوئی آواز میں رکتے رکتے) ختم ہو گیا ۔ پوری بات بھی نہ سنی ۔

بسم اللہ

ثباتِ قصر و در و بام، خشت و گل کتنا
عمارتِ دلِ درویش کی رکھو بنیاد.

ماہنامہ تعمیر بھوپال

فی پرچہ ۸ر

سالانہ صہ ر

دارالاشاعت تعمیرِ ادب

ماہنامہ

تعمیر

سرپرست
حضرت علامہ مولانا
محوی صدیقی لکھنوی
چندہ سالانہ (ع۸ر)

دار الاشاعت :-
تعمیر ادب بھوپال

مدیر
حامد صدیقی
بی، اے (جامعہ)
فی پرچہ (۸ر)

جلد ۱	بابت ماہ مئی ۱۹۴۷ء	شمارہ ۵

سُرخیاں

اذکار و افکار

ادارہ

زبان کی خدمت کے لئے کسی مقام کو جو اہمیت حاصل ہو جاتی ہے وہ مسلّم ہے، لیکن اب ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم ہر شہر کو اُردو کا مرکز قرار دیں اور وہاں سے چاروں طرف اُردو کی روشنی پھیلا کر مفید تر کام سرانجام دیتے رہیں۔ اس اہمیت کو مد نظر رکھتے ہوئے وسط ہند میں بھوپال کا انتخاب نہایت موزوں ہے۔ یہی ایک ایسا مقام ہے، جہاں بیٹھ کر ہم اپنی آواز شمال و جنوب اور پورب، پچھم تک یکساں پہنچا سکتے ہیں۔

یہ واقعہ ہے کہ شمالی ہند مدت سے زبان و ادب کی خدمت کا اہم فرض ادا کر رہا ہے، اس نے اپنی ذمہ داری کو پوری طرح سمجھا اور اس کا حق ادا کیا ہے، مگر اس لمبے چوڑے ملک کا پچھمی، اور دکنی حصہ زبان و ادب اُردو کی خدمت کے لحاظ سے نسبتاً اپنے حق اور فرض کی ادائی میں کسی قدر قاصر اور پیچھے رہ گیا ہے، اس لئے ادھر کام کرنے کی ضرورت زیادہ ہے۔ تاہم پچھم میں ہندوستان کا عظیم الشان "عروس البلاد" شہر بمبئی چند سال سے اُردو اخبارات اُردو رسائل، ہندستانی فلمی اداروں کا مرکز بن رہا ہے۔ بلحاظ تعداد اس نے کافی ترقی کی ہے۔ اور بلحاظ معیار ہنوز ترقی کی بہت زیادہ گنجائش نظر آتی ہے۔ بحمد اللہ آثار امید افزا ہیں۔

یہی حال دکن میں تقریباً حیدر آباد کا ہے کہ لاہور و دہلی کے بعد وہ اردو اخباروں اور ماہناموں کا بڑا مرکز بن گیا ہے۔ خصوصاً اس سال وہاں سے بے شمار رسالے اور اخبار جاری ہونے کی خبریں مل رہی ہیں، جو امید افزا اور مسرت بخش ہیں۔ اس کے علاوہ ایک خصوصیت خدمت زبان کی اسے ایسی حاصل ہے، جو اس ملک کے کسی صوبے اور کسی ریاست کو حاصل نہیں، اور وہ ہے جامعۂ عثمانیہ کا وجود! جو اب تک پورے ملک میں ایک ہی اُردو یونیورسٹی (جامعہ) ہے۔

مدراس اور صوبۂ متوسط کئی وجوہ سے نسبتاً زیادہ پیچھے ہیں۔ ایک وجہ ممکن ہے مسلمانوں کی کمی اور وہ بھی نمایاں کمی ہو، دوسری وجہ غالباً اور دوسری مقامی زبانوں کی موجودگی اور رواج بھی ہے، جو شمال میں اس درجے پر نہیں۔ بہر حال ہمیں کام کرنا ہے اور ہمارا رُخ زیادہ تر ادھر ہی ہوگا، اور وقت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ہونا چاہئے اس لئے ہم زبان اور بیان کے لحاظ سے بھی وہی طریقے اختیار کرنا ضروری اور مناسب سمجھتے ہیں، جو حالات اور ان مقامات کے لحاظ سے شائستہ اور مناسب تر ہیں۔

ہم نے یہ نقطہ بھی پیش نظر رکھا ہے کہ تعمیر محض تفریحی اور افسانوی رسالہ ہو کر نہ رہ جائے، بلکہ ادبی اور علمی حیثیت سے افادی پہلو نمایاں اور روشن تر رہے۔ ہمیں تسلیم ہے کہ ابھی ہم پورے طور پر اپنے ان مبارک بلند اور ضروری عزائم میں کامیاب نہیں ہوئے ہیں، لیکن پہلے ہی نمبر سے ہمارے اس رجحان کا اندازہ ہو سکتا ہے اور آہستہ آہستہ تعمیر ترقی کر رہا ہے۔ اللہ نے چاہا تو یہی تعمیری پہلو مفید تر، اور کامیاب تر ثابت ہوگا۔ گذشتہ شمارے میں تعمیر کی نسبت چند رائیں شائع کی ہیں۔ ان حوصلہ بڑھانے والے قدردانوں میں کئی کہنہ مشق اساتذۂ فن، شاعر و ادیب بھی ہیں، اور کئی نوجوان انشا پرداز و سخن ور بھی۔ ان بزرگوں اور ہم عمروں کی اس نوازش کے شکرگزار ہیں کہ پہلے ہی نمبر پر ہمارے ارادوں کو بھانپ لیا اور کافی حوصلہ افزائی فرمائی، دوسرے شمارے پر اور زیادہ اچھی اور ہمت آفریں رائیں ملیں، ساتھ ہی بہت سے احباب اور بزرگوں نے ہماری کوتاہیوں سے بھی آگاہ فرمایا۔ جو کمی محسوس کی، اس کا اظہار کیا، اور تعمیر کی ترقی کے لئے مختلف، مفید، کارآمد مشورے دیئے ہیں۔ نکتہ چینیاں بھی فرمائی ہیں، ہم ان احباب اور بزرگوں کے بھی اسی قدر منت پذیر ہیں، جتنے ان بزرگوں اور دوستوں کے جنھوں نے حوصلہ افزائی اور مدح سرائی سے کام لیا ہے۔ کیونکہ نکتہ چینیوں، مشوروں اور اظہار نقائص ہی سے ترقی کی بہت سی دشوار گذار منزلیں آسان، بلکہ آسان تر ہوتی ہیں۔ سب سے بڑی خوشی یہ ہے کہ ان تمام تحریروں اور کرمناموں میں، اخلاص و محبت کی روح اور اصلاح و ترقی، فائدہ رسانی، اور خدمت علم و ادب کا جذبہ کارفرما ہے۔ تخریبی انداز اور معاندانہ پہلو ذرا بھی نہیں۔ اب تک ملک کے کسی گوشے سے کوئی ایسی آواز بلند نہیں ہوئی ہے۔ اگرچہ اس کا امکان بھی ہے اور ہر کام کرنے والے کو اس منزل سے گذرنا بھی ضروری ہے، چاہے وہ چھوٹا ہو، یا بڑا، بہرحال ہم اس کے خیر مقدم اور پذیرائی کے لئے بھی بسر و چشم حاضر ہیں:

"سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی"

جس طرح ارباب قلم اور اہل علم و ادب نے تعمیر کا بلند آہنگی، اور وسیع حوصلے کے ساتھ خیر مقدم کیا، جس کا ہم نے اوپر کی سطروں میں اظہار کیا ہے، اسی طرح ہم نہایت مسرت اور جذبات شکرگزاری کے ساتھ یہ اعلان کرنا بھی ضروری فریضہ سمجھتے ہیں کہ مالی امداد، خریداری اور اشاعت کی توسیع کے لحاظ سے بھی اکثر معاونین اور کرمفرماؤں نے پورا حق محبت ادا کیا، اور کر رہے ہیں۔ خدائے برتر کے اس بے پایاں الطاف کا جتنا بھی شکر ادا کیا جائے، کم ہے، کہ اس لحاظ سے بھی امید سے زیادہ تعمیر کامیاب ہے —— یہ مژدہ تعمیر کے اور مخلص بہی خواہوں کے لئے بہت مسرت اور اطمینان کا سبب ہوگا، خصوصاً ان بہی خواہوں کے لئے

جو احتیاط، اندیشہ، خطرہ اور یاس کے پہلو کو ہر کام میں زیادہ ملحوظ نظر رکھتے ہیں۔ انشاء اللہ آئندہ ہم اور امید افزا بشارتیں سنا سکیں گے۔

۲ دو غلط فہمیاں اور اُن کا ازالہ

(۱) گذشتہ شمارے کے سرورق کے دوسرے صفحے پر ایک اشتہار "بزمِ تعمیرِ سخن" کا شائع ہوا ہے جس میں غزلیں، نظمیں، سہرے، تہنیت نامے، گیت وغیرہ معاوضے اور قیمت پر لکھنے کا اعلان ہے، اس بزم کے ناظم نے خط و کتابت کے لئے "معرفت رسالہ تعمیر" پتہ دیا ہے۔ یہ اشتہار شائع نہ ہونا چاہئے تھا، مگر میری غیر موجودگی میں جبکہ میں مدراس گیا ہوا تھا، شائع ہوگیا۔ اسے دیکھ کر ناظرین کو یہ شبہ ہونا ضروری تھا کہ اس بزم کا بھی کوئی لگاؤ تعمیرِ ادب سے ہے۔ ہمارے ایک تعمیرِ ادب کے سچے کرمفرما نے ہمیں اس پر متنبہ بھی کیا، اور بازپرس بھی کی۔ ہم اپنے بزرگ اور عزیز دوست کے اس بروقت انتباہ کے ممنون ہیں۔ اب یہ اور اس قسم کا کوئی اشتہار شائع نہ ہوگا۔ اور ہم واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ اس بزم کا کوئی واسطہ تعمیرِ ادب یا تعمیر سے نہیں۔ نہ ہم اس "سخن فروشی" کے مرتکب ہوئے اور نہ اسے اپنے مذاق و طبیعت کے لحاظ سے پسند کرتے ہیں خصوصاً حضرت نگراں صاحب قبلہ مدظلہٗ سخت ناپسند فرماتے ہیں۔ جن حضرات نے یہ خیال کر رکھا ہے کہ تعمیر یا ادارۂ تعمیرِ ادب سے اس کا کوئی ناتا ہے، وہ براہ کرم نوٹ فرمالیں!۔

(۲) حضرت قبلہ مولانا محوی مدظلہٗ کی سرپرستی کا نام ہونے کی وجہ سے بعض نازک خیال اور دور بیں حضرات کو یہ خیال ہوا کہ یہ تعمیر کسی خاص پارٹی یا جماعت کا علمبردار ہے اور ایسا نہ ہونا چاہئے، حضرت موصوف سے جو لوگ واقف ہیں، وہ جانتے ہیں کہ مولانا مدظلہٗ کبھی پارٹی بندی کی لعنت میں گرفتار نہیں ہوئے اور انھیں اس سے ہمیشہ نفرت رہی، جو کچھ علمی اور عملی خدمت زبان و ادب کی، اُن سے عمل میں آئی، وہ ان تنگ خیالیوں اور بداندیشیوں سے پاک اور بالاتر رہی۔ وہ جہاں گئے اور رہے اس مقدس خدمت کے دامن کو انھوں نے ان خرافات سے آلودہ نہ ہونے دیا۔ ان کی پوری زندگی او۔ تمام احباب اور قریب سے دیکھنے والے اس بات کے شاہد ہیں۔ لہٰذا تعمیر بھی واضح رہے کہ کسی پارٹی کا آرگن یا نمائندہ نہیں، خالص ادب اور زبان کی خدمت اس کا واحد مقصدِ حیات ہے اور یہی زندگی بھر رہیگا!۔

کل ہند انجمن ترقی اردو

نے اپنی زندگی میں، پورے ملک کے طول و عرض میں اس مشترکہ اور عام ملکی زبان کی جو علمی اور ادبی خدمت انجام دی ہے وہ کسی

تعارف اور بیان کی محتاج نہیں۔ سارے "برِ اعظم ہند" میں یہی ایک ادارہ ہے جس نے اس عظیم الشان خدمت کو اپنے ذمّے لے رکھا ہے۔ اس نے فرض کو کمال دیانت و سرگرمی کے ساتھ ادا کیا اور کر رہی ہے مگر اس دیس کے ہر رہنے والے کو اس انجمن کی جو امداد اور تائید کرنا چاہیے تھی، وہ نہ کی گئی، ہر فرد تو کیا کرتا، سرمایہ داروں، دولتمندوں اور رئیسوں نے بھی وہ اعانت نہ فرمائی، جس کی اس اہم ضرورت اور بلند خدمت کے لحاظ سے لازم تھی۔ بہر حال اس کا کام روز بروز بڑھتا رہا۔ البتہ حیدر آباد کی حکومت نے ابتدا ہی سے اس انجمن کی مالی امداد کی، اور کام کی ترقی کے ساتھ اس میں اضافہ ہوتا رہا، اب یہ امداد چالیس ہزار روپیے سے کچھ زیادہ مل رہی تھی۔ لیکن کس قدر رنج اور افسوس کا مقام ہے کہ موجودہ حکومت نے بعض نامعقول اور بے بنیاد وجوہ کی بناء پر یہ امداد بند کر کے تمام ملک کے دلوں کو دُکھا دیا۔ خدا جانے ریاست کے صدرِ اعظم صاحب کو اُردو یا ہندوستانی سے کیا للّٰہی بیر ہے کہ جب تک وہ ریاست میسور میں رہے، میسور یونیورسٹی اور مہاراجہ کالج میں اُنھوں نے اُردو کو بلند مقام نہ دیا اور اُردو پروفیسر مقرر نہ ہونے دیا۔ اپنے ایک ہم وطن ایرانی دوست کو فارسی عربی کا پروفیسر رکھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُردو وہاں اپنی رفتارِ ترقی میں پیچھے رہ گئی، خدا خدا کر کے ان دونوں کے جانے کے بعد اُردو پروفیسر کی سیٹ منظور ہوئی اور پروفیسر سروری صاحب کا تقرر عمل میں آیا۔

جیپور ریاست میں دیوانی کے منصب پر سرفراز ہو کر سر اسمٰعیل صاحب نے اپنی اُردو دشمنی کا وہ کھلا ہوا ثبوت دیا کہ سارا ملک چیخ اُٹھا، اور اس سرے سے اُس سرے تک وہ لے دے ہوئی کہ خدا کی پناہ۔ انجمن ترقی اُردو نے بھی پورا مقابلہ کیا۔ اس سے موصوف کے دل میں انجمن اُردو کی مخالفت کا جذبہ اور زیادہ جڑ پکڑ گیا۔ حیدر آباد میں صدرِ اعظم ہو کر اپنے انتقام کے جذبے کو بروئے کار لانے کا اُن کو موقع ملا، اُنھوں نے انجمن کی وہ امداد بند کر دی، جو رُبع صدی سے مل رہی تھی۔ اس بے جا کارروائی سے سارے ملک میں کہرام مچ گیا۔ اُردو کا تقریباً کوئی ایسا رسالہ یا اخبار نہیں جس نے اس "انتقام بیجا" اور "اُردو کُشی" کے خلاف آواز نہ بلند کی ہو ——— تعمیر اور ادارۂ تعمیرِ ادب بھی اس معاملے میں سارے ملک کا ہمنوا ہے۔ اب ہماری دلی آرزو اور حکومت حیدر آباد سے درخواست ہے کہ وہ جلد سے جلد اس امداد کو جاری فرما کر اپنی دائمی ہر دلعزیزی کے دامن کو اس داغِ رسوائی سے بچائے، جو اس کے نادان دوست، خیر خواہی کے پردے میں، لگانا چاہتے ہیں اور جس سے اب تک وہ پاک رہا ہے ———!

یہ نوٹ لکھنے کے بعد سُنا ہے کہ امداد جاری اور بحال ہو گئی ہے، الحمد للہ!

معزز وزیر تعلیم بھوپال کا ادارۂ تعمیر میں ورود

ریاست بھوپال وسط ہند میں ایک چھوٹی سی اسلامی ریاست ہے۔ لیکن اپنی علم نوازی، ادب پروری اور سیاسی بیداری کے لحاظ سے ملک کی بہت سی بڑی بڑی ریاستوں سے زیادہ ممتاز، نامور اور پیش پیش رہی ہے۔ حالات کے تقاضے سے ہمیشہ اس میں اصلاحات نافذ ہوتی رہیں اور اختیارات عوام کے نمائندوں کو سپرد کئے جانے کی کوششیں جاری رہیں۔ اس سال اپریل کی ۱۵ تاریخ کو اعلیٰ حضرت فرمانروائے بھوپال خلد اللہ ملکہٗ نے عام رعایائے ملک میں سے تین حضرات کو منصب وزارت پر سرفراز فرمایا اور تعلیمات وصحت عامہ کا قلمدان وزارت جناب مولانا سعید رزمی کے حوالے ہوا۔ جو یہاں کے مخلص راہنما اور رعایا کے دیرینہ خادم ہیں۔ افسوس ہے کہ تعمیر کے صفحات کی تنگ دامانی مولانا موصوف کے خدمات ملکی وسیاسی کو تفصیل سے پیش کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔

مولانا رزمی، تعمیر اور ادارۂ تعمیر ادب کے ارکان خصوصاً حضرت قبلہ مولانا محوی مدظلہٗ سے محبت ومودت کے دیرینہ اور خصوصی تعلقات رکھتے ہیں، اس بنا پر ادارے نے آپ کو چاء پر مدعو کیا، جسے مخلص موصوف نے اپنی انتہائی مصروفیت اور بیحد کاموں کے باوجود نہایت کشادہ دلی اور محبت سے قبول فرمایا اور تشریف لاکر ادارے کو شکریے کا موقع دیا۔ بہت سے مفید مشورے دیئے۔ دلی مسرت اور خوشنودی کا اظہار کیا۔ اس مختصر صحبت میں، ارکان ادارے کے علاوہ بھوپال کے مشہور شاعر جناب اصغر شعری اور مولوی اصغر حسین صاحب مالک علوی برقی پریس، سید یوسف علی صاحب مالک غریب نواز کیپ فیکٹری بھوپال بھی شریک تھے، اور معزز وزیر تعلیمات کو تینوں اداروں کی جانب سے پھول کے ہار پہنائے گئے۔

ہم اس انتخاب پر تینوں منتخب وزرا خصوصاً جناب مولانا سعید رزمی کو اپنی اور ادارے کی جانب سے دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

مولانا کی رائے تعمیر کے آئندہ شمارے میں شائع ہوگی، اور انشاء اللہ کلام بھی۔

جون سنہ ۱۹۴۷ء کے شمارے سے تعمیر میں علمی اور ادبی سوالات کے جوابات شائع کئے جائیں گے۔ علمی معلومات کے لئے یہ جوابات بیش بہا خزانہ ہونگے۔ سوالات مختصر اور مفید روانہ کیجئے۔ فلمی اور بیہودہ سوالات نظر انداز کر دیئے جائیں گے۔

(مدیر)

اساتذہ سے خطاب

فہمی ترمذی

اے جناب صدر! اے یارانِ محفل! التفات
بعدِ مدت آج پھر فہمی نے کھولی ہے زباں
فرصتِ یک لمحہ اور افسانۂ ماضی دراز
میں نہ دُہراؤں گا ساری داستانِ باستاں

نظم اور اُس کی طوالت بارِ خاطر ہو نہ جائے
میں نظر انداز کر جاؤں گا پوری واردات
ربط رکھنے کے لئے ہوں گے ضروری جس قدر
مختصر انداز میں اُتنے کہوں گا واقعات

ہم مُقِر ہیں پائے تھے یونان سے کچھ علم و فن
لیکن اُس کے ساتھ یہ بھی ہے تکلف برطرف
مُتّبِعِ خُذ ما صفا، دَع ما کدر، نظروں میں تھے
چھانٹ لیتے تھے جواہر، چھوڑ دیتے تھے خزف

اور پھر یہ بھی مُسلّم ہے کہ ہم قانع نہ تھے
ہم کو جو قطرہ ملا اُس کو سمندر کر دیا
مل گئیں ٹوٹی ہوئی، بکھری ہوئی، اینٹیں اگر
قصر اک تعمیر اُن سے ہم نے اکثر کر دیا

گرچہ ہے یونان کے آگے سرِ تسلیم خم
جوہرِ قابل کی اپنے گھر بھی کمیابی نہ تھی
فخرِ رازی اور غزالی کا ممکن ہے جواب
کیا مسلّم عظمتِ سینا و فارابی نہ تھی

وہ قدامہ اور ادریسی کے جغرافی اُصول
ماہرِ علمِ ریاضی و مساحت وہ حسن
اور وہ علامۂ تاریخ ابنِ خلدون
فلسفے میں اور وہ ابنِ رشد سا یکتائے فن

تہ کیا ہے مشرق و مغرب نے زانوئے ادب
بخل اوروں کی طرح اپنی نگاہوں میں نہ تھا
قرطبہ ہو یا بخارا، مصر یا بغداد ہو
کیا صلائے عام ان سب درسگاہوں میں نہ تھا

ہے مگر یہ بھی حقیقت ہر کمالے را زوال
رُک گئی علمی ترقی فتنۂ تاتار میں
شمع کی وہ آخری لو تھی جو دیکھی خلق نے
بارگاہِ صفویہ میں یا مغل دربار میں

ہو گئے جب نذر یہ بھی گردشِ ایام کے
پھر تو کوئی سرپرستی کے لیے باقی نہ تھا
میکدہ بھی تھا، مئے و مینا بھی، مے آشام بھی
مے فروشی کے لیے لیکن کوئی ساقی نہ تھا

دستِ ہمت جب تلک سر پر حکومت کا نہ ہو
چل نہیں سکتا ادارہ کوئی دنیا میں کبھی
کس مپرسی نے کچھ ایسا ہم کو برگشتہ کیا۔
رفتہ رفتہ یاد بھی نذرِ تغافل ہو گئی

دفعتاً مغرب سے اُمڈا ایک سیلابِ عُلوم — ہند کی نظروں کو خیرہ کر گئی جس کی چمک
اس روش سے چونکہ نامانوس تھے اپنے قدم — اس لئے بے گانگی باقی رہی کچھ روز تک

فیضِ سرسیّد نے آخر کر دیا مائل ہمیں — قوم کے سَر پر ہے اِس احسان کا بارِ گراں
کون سیّد؟ بانیِ کالج ، فدائے مُلک و قوم — کون سیّد؟ فخرِ ملّت ، نازشِ ہندوستاں

بعد اس کے ہند میں ایسا بھی گذرا ایک دَور — ہوگیا اپنا وطن خود اپنی نظروں میں حقیر
ہِل گیا بنیاد سے اک بار قومیت کا قصر — ہو گئے اہلِ وطن ذہنی غلامی میں اسیر

خیر یہ بھی ہو چکا ، لیکن لیا جب جائزہ — ہم نے اپنے خُلق کا ، ایثار کا ، آداب کا
تب ہوا محسوس ہم کو واقعی سود و زیاں — یعنی جو حاصل کیا اُس سے زیادہ کھو دیا

دیکھ کر یہ رنگ اب اقبالؔ سا بالغ نظر — کہہ اُٹھا آخر "ترے رندوں کو پھر آیا ہے جوش"
"ہر طرف غل ہے کہ لا ساقی شرابِ خانہ ساز — دل کے ہنگامے مئے مغرب نے کر ڈالے خموش"

ہوشیار ، اے حاملِ تعلیمِ مشرق! ہوشیار — دسترس یہ چاہتے ہیں ہر نئی تحقیق پر
اس لئے مغرب سے ہو سکتے نہیں یہ بے نیاز — اور مشرق، طالبِ تہذیبِ مشرق ہے اِدھر

کھُل رہی ہے رفتہ رفتہ پھر خمار آلود آنکھ — بادہ نوشوں کو مئے و مینا کی پھر ہے جستجو
اُٹھ رہی ہے ملک و ملت کی نظر تیری طرف — پوچھتا ہوں، کیا انھیں سیراب کر سکتا ہے تو

وقت کے دونوں تقاضے ہیں اگر پیشِ نظر — تو تجھے اپنا عمل تبدیل کرنا چاہیے
پیکرِ مغرب میں یعنی روحِ مشرق پھونک کے — مشرقیت کی تجھے تکمیل کرنا چاہیے

خود نمونہ بن کے پہلے مشرقی آداب کا — از سرِ نو تو نظامِ درس یوں ترتیب دے
ایک معجونِ مُرکّب اس طرح تیار کر — مغربی اجزا کو لے کر مشرقی ترکیب دے

الغرض یوں مشرقی سانچوں میں ڈھل جائیں دماغ — پھر کبھی بیگانۂ تہذیبِ مشرق ہو نہ جائیں
پرورش پا جائیں اتنے مشرقی ماحول میں — جائیں یورپ بھی تو مثلِ عابد[1] و اعزاز[2] آئیں

---

[1] ڈاکٹر عابد حسین (بھوپالی) ایم اے - پی ایچ ڈی - (برلن)۔

[2] مسٹر اعزاز الدین خاں (بھوپالی) ، ایم اے - ایم ایڈ (انگلینڈ)۔

خیر یہ تو بحث تھی اک عام، گستاخی معاف — آپ لوگوں کی طرف اب خاص ہی روئے سخن
آپ کے ہاتھوں میں مستقبل ہے ملک و قوم کا — آپ کے قبضے میں ہے سرمایۂ فخرِ وطن
گو نہایت ہی اہم ہے ذمہ داری آپ کی — لیکن اُس کی وسعتوں کی بھی نہیں کچھ انتہا
اِن دماغوں اِن دلوں میں آپ ہی پیدا کریں — ولولہ حُبِّ وطن کا حوصلہ ایثار کا
آپ اگر مانیں تو یہ بھی آپ ہی کا کام ہے — نونہالانِ وطن میں پھونکنا روحِ عمل
آپ ہی کا فرض ہے نگرانیٔ اخلاق بھی — آج ہی سے وہ بنائیں جو انھیں بننا ہے کل
آپ اِن میں ایک قومیت نئی پیدا کریں — جو عقائد سے جدا ہو، دورازِ پست و بلند
اتحادِ عام مسلک، ملک کی خدمت شعار — اختلافِ باہمی دل سے کرے جو ناپسند
آپ ہو جائیں اگر ان کوششوں میں کامیاب — تو یقیناً آپ ہوں گے قابلِ صد احترام
مُلک میں مشکور ہو گی آپ کی سعیِ عمل — اور ہمیں کے لئے ہو گا یہ نازش کا مقام

نیرنگِ احساس

شاذ تمکنت دری، مدیر ماہنامہ "شالیمار"

سیہ حجاب ہیں سخت بند دل فضول پھرتے ہیں سرد آہیں
قفس کو بھی ساتھ لے اُڑیں یہ اگر قفس سے نکلنا چاہیں
نقاب اُٹھا دی اگرچہ تم نے نگر میں دیکھوں نہیں تو کیونکر
تمہارے جلووں کی روشنی میں بھٹک رہی ہیں مری نگاہیں
عجیب منزل ہے ان کی منزل پتہ نہیں خضر کو بھی جس کا
مسافروں کا تو ذکر کیا ہے کہ خود بھی گم ہو گئی ہیں راہیں
مرے تخیل کا ماحصل ہیں - مرے تصور کی زندگی ہیں
دراز گیسو - حسین آنکھیں جمیل چہرہ - گداز بانہیں
خوشی کے نغموں میں کارفرما بشر کی بیچارگی کے نوحے
ہر اک تبسم کی تہ میں آنسو - ہر اک مسرت کی تہ میں آہیں
جسے حسین تو سمجھ رہا ہے وہ درحقیقت حسیں نہیں ہے
فریب خوردہ تری طبیعت - فریب خوردہ تری نگاہیں
نظامِ عالم بدل رہا ہے خدا بھی شاید نیا بنے گا
نئے نئے سے ہیں سب پجاری - نئی نئی سی ہیں خانقاہیں
رہِ طلب میں جو تھک کے بیٹھے مری نظر میں وہ بے خرد ہے
رہِ طلب میں قیام کیسا - رہِ طلب میں کہاں پناہیں

ڈاکٹر سید نور الحسن ہاشمی

ذاکر صاحب

اردو زبان میں اچھی سوانح عمریوں کی یوں بھی بہت کمی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اب بڑی لمبی سوانح عمریوں کے لکھنے اور پڑھنے کا زمانہ بھی نہیں رہا۔ زندگی اس قدر مصروف اور عجلت پسند ہوگئی ہے کہ ہمارے لئے دلچسپ ناولوں کا پڑھ لینا بھی ایک دشوار کام ہوگیا ہے۔ پھر سوانح عمریوں میں تو خصوصاً جب ایک ہی شخص کے حالات مختلف پہلوؤں اور مختلف زاویوں سے دیکھے اور پرکھے جاتے ہوں تو اس کا پڑھنا اور بھی اجیرن ہوجاتا ہے۔ وہ سوانح عمری چاہے کتنی بڑی شخصیت کے متعلق کیوں نہ ہو چاہے کتنے دلچسپ انداز میں کیوں نہ لکھی گئی ہو، نہ ہمارا جی اس میں لگتا ہے اور نہ ہمیں اس قدر فرصت ملتی ہے کہ اس میں جی لگا سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ حالی کی حیات جاوید، باوجودیکہ بڑی محنت سے ترتیب دی گئی تھی اور باوصف اس کے کہ وہ ایک بہت بڑی ہستی یعنی سرسید کے متعلق ہے، اب صرف ہمارے طاق نسیان کی زینت ہوکر رہ گئی ہے۔ ممکن تھا کہ اگر اس میں سرسید کی عظمت کے علاوہ اُن کی وہ باتیں بھی پیش کی جاتیں جو ہماری زندگی میں روزمرہ پیش آتی ہیں، یعنی کچھ غلطیاں بھی، کچھ حماقتیں بھی، کچھ سنکیں بھی، اور کچھ لغزشیں بھی، تو حیات جاوید کی مقدس عظمت میں جان پڑ جاتی اور شاید ہم اسے اتنی جلد بھلا نہ بیٹھتے۔ پھر بھی ان سب باتوں کے باوجود اب یہ امر مسلّم ہے کہ بڑی سوانح عمریوں کے پڑھنے کا زمانہ نہیں رہا۔

ہاں اب جو سوانح عمری کا نیا بدل پیش ہوا ہے، وہ ہے خاکہ نگاری، یعنی کسی شخص کی زندگی کا ایسا خاکہ یا اسکیچ پیش کرنا، جو مختصر بھی ہو اور جامع بھی، یعنی مختصر اتنا ہو کہ ہم اسے ایک نشست میں پڑھ بھی ڈالیں اور جامع ایسا ہو کہ اُس کی شخصیت کا کوئی پہلو نظر انداز بھی نہ ہونے پائے، اس پر اگر انداز بیان بھی دلچسپ ہو تو یہ خاکہ نگاری بہت ہی کامیاب ہوجاتی ہے۔ موجودہ زمانہ میں سب سے پہلے، جہاں تک میرا خیال ہے، سب سے زیادہ کامیاب خاکہ جناب فرحت اللہ بیگ صاحب نے نذیر احمد مرحوم کی زندگی کے متعلق لکھا تھا۔ جس کی دلچسپی اُس کے عنوان ہی سے ظاہر ہے۔ یعنی "نذیر احمد کی کہانی، کچھ ان کی کچھ میری زبانی"۔ جس دلچسپ انداز اور جس خوبی سے نذیر احمد کی سیرت کا مکمل خاکہ اس کہانی میں پیش کیا گیا ہے، اس نے اس کہانی کو ہمارے اردو ادب میں ایک مستقل جگہ دیدی ہے۔ اس کے بعد مولوی عبدالحق صاحب کی کتاب 'چند ہمعصر' چھپی۔ اس کے مضامین بھی بہت خوب ہیں۔ اس میں مولوی صاحب موصوف نے جن بڑی چھوٹی ہستیوں کی روزمرہ کی زندگی کو جس سلیقے اور خوبصورتی سے

پیش کیا ہے، اُن سے ہماری نظر میں اُن ہستیوں کا وقار اور بھی بڑھ جاتا ہے۔

اس وقت رشید احمد صاحب صدیقی کی کتاب "ذاکر صاحب" پیش نظر ہے۔ یہ کتاب بلکہ کتابچہ دراصل جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کی جوبلی کے موقع پر ذاکر صاحب کی شخصیت اور اُن کے کام کو اجاگر کرنے کی خاطر ذاکر صاحب کی مرضی کے خلاف لکھا گیا تھا۔ چنانچہ رشید صاحب نے شروع کتاب ہی میں اپنے مخصوص انداز میں یہ جملہ لکھ کر عام اڈیٹروں کے برخلاف تمام ذمہ داری اپنے سر اوڑھ لی ہے کہ "مضمون نگار کا ذاکر صاحب کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے" اس بات کا افسوس رہا کہ یہ کتابچہ خاص جوبلی کے موقع پر چھپ کر اس لئے نہ آسکا تھا کہ اُس زمانے میں دلی شہر کی فضا بہت خراب ہو رہی تھی۔ بہرحال اب یہ ہمارے سامنے ہے اور ہم اس پر دو طرح سے خامہ زنی کرسکتے ہیں۔ اول تو یہ کہ موضوع کے پیش کرنے میں مصنف نے خواہ مخواہ جانب داری سے کام تو نہیں لیا ہے، آیا موضوع واقعی ایسا ہے جیسا کہ پیش کیا گیا ہے اور دوسرے یہ کہ خود مصنف اپنے انداز بیان اور موضوع پیش کرنے کے طریقے میں کہاں تک کامیاب ہوا ہے اور کوئی بات رہ تو نہیں گئی ہے۔

جہاں تک ذاکر صاحب کی شخصیت کا تعلق ہے، وہ لوگ جو اُن کے ساتھ رہ چکے ہیں، یا جنھیں اُن کے ساتھ یا اُن کے ادارے کے کسی شعبے میں کام کرنے کا موقع ملا ہے، وہ یقیناً رشید صاحب کے اس بیان سے حرف بحرف اتفاق کریں گے کہ "جامعہ کا ہر چھوٹا بڑا ہمہ وقت یہ دیکھتا ہے کہ وہ خود کیا ہے اور کیا کر رہا ہے۔ اور ذاکر صاحب کیا ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ سارا قضیہ اسی ترازو میں تل کر ختم ہو جاتا ہے۔ ذہنی قابلیت میں جو شخص اپنے کو بڑا سمجھتا، ذاکر صاحب کی ذہنی قابلیت کے سامنے سر جھکا دیتا، اپنے ایثار، قربانی اور اخلاقی فضائل کا کسی کو خیال آتا تو وہ یہ پاتا کہ ان فضیلتوں میں بھی ترازو کا پلڑا ذاکر صاحب کی طرف جھکتا ہے۔ خاندانی شرافت و نجابت یا سوشل اور سرکاری تعلقات یا رسوخ پر کسی کو ناز ہوتا تو وہ یہ پاتا کہ ان کا سرمایہ خاندانی اعتبار سے بھی زیادہ خالص ہے اور اس کے تعلقات بھی زیادہ وسیع، زیادہ مستحکم اور زیادہ وسیع ہیں۔ محنت کرنے اور فرائض سے عہدہ برآ ہونے کو دیکھتا تو ذاکر صاحب جیسا محنت شاق کرنے والا، اور اپنے فرائض پر آرام و تفریح کو قربان کر دینے والا حلقے میں ان جیسا اور کوئی نہ تھا۔ کسی کو اپنی فطانت و ذہانت اور فطانت کا دعویٰ ستاتا تو وہ دیکھتا کہ اس وادی میں بھی امام ذاکر صاحب ہی ہیں۔ کلرک یہ دیکھتا کہ ذاکر صاحب اس سے زیادہ کلرکی کرتے ہیں۔ چپراسی یہ پاتا کہ ذاکر صاحب اُس سے زیادہ دوڑ دھوپ اُٹھاتے ہیں اور چھوٹے سے چھوٹا کام بھی اپنے ہاتھ سے کرنے میں پیش پیش رہتے ہیں۔ جوان یہ محسوس کرتا کہ ذاکر صاحب اُس سے زیادہ جوان ہیں، اور بوڑھا یہ جانتا کہ جب بڑھاپا ذاکر صاحب کے قریب جانے سے ڈرتا ہے تو پھر وہ کیوں بڑھاپے کو خاطر میں لائے "

اس جامع بیان میں رشید صاحب نے ذاکر صاحب کی شخصیت کو پوری طرح سمیٹ کر رکھ دیا ہے۔ اس بیان میں نہ کسی طرح کی مبالغہ آمیزی ہے اور نہ اپنے زورِ بیان کی نمائش۔ عام آدمی جب کوئی کام کرتا ہے تو کسی انعام کی خاطر یا کسی ڈر اور دباؤ کی وجہ سے یا پھر شہرت، عظمت یا دولت کو علانیہ یا پوشیدہ طور پر حاصل کرنے کی خاطر۔ لیکن بعض برگزیدہ ہستیاں ان تمام ظاہری اور معروف جبلی محرکات سے بلند ہو جاتی ہیں اور دوسروں کی خدمت محض خدمت کی خاطر کرتی ہیں۔ انھیں اسی میں لطف آتا ہے اور اسی خدمت کے کام میں اپنے کو مٹا دینا وہ سرمایۂ حیات اور حاصلِ زندگی جانتے ہیں۔ وہ نیکی کرتے ہیں، محض نیکی کرنے کی خاطر، تعریف و توصیف سے پاک۔ ڈر اور لالچ سے منزّہ۔ یہی وہ اخلاقی معراج ہے، جس پر پہنچکر آدمی انسان ہو جاتا ہے لیکن یہ بات آجکل کے مادہ پرستوں کی سمجھ میں ذرا مشکل سے آئیگی۔

رشید صاحب، ذاکر صاحب کے بڑے پکے اور بڑے پُرانے دوستوں میں ہیں۔ ممکن ہے بعض لوگوں کو بعض مقامات پر ذاکر صاحب کی بے جا حمایت یا بے جا طرفداری کا شبہ ہو، لیکن یہ بات حقیقت سے دور ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ رشید صاحب میں اتنی ہیرو پرستی نہیں کہ وہ محبت کی خاطر صداقت کا خون کر دیں۔ رہی محبت اور عقیدت تو اس میں کوئی کلام نہیں کہ رشید صاحب ذاکر صاحب کے پرستاروں میں ہیں۔ کتاب کا سب سے پہلا صفحہ ہی اس بات کی گواہی دے رہا ہے۔ دیکھیے کس مزے میں شروع کرتے ہیں:

"ذاکر صاحب کی آنکھوں میں شدید تکلیف تھی۔ علاج کے لئے بمبئی جا رہے تھے۔ دہلی کے اسٹیشن پر خدا حافظ کہنے کے لئے میں بھی موجود تھا۔ گاڑی روانہ ہوئی تو دل بھر آیا۔ طرح طرح کے وسوسے پیدا ہوئے۔ انسانی فطرت کو آڑے وقت میں تنکے تک کا سہارا ڈھونڈھ لینے کا عجیب ملکہ ہے۔ مجھے بھی آس پاس ہی سہارے مل گئے۔ میں نے خیال کیا بھوک لگی ہے۔ جوتا نیا بھی ہے تنگ بھی۔ دن بھر دلی کی خاک چھانتا پھرا ہوں، کسی نے خلاصۂ موجودات سمجھنا تو درکنار "ہر مال چھ پیسے" سے بھی مخاطب نہ کیا۔ ممکن ہے یہی باتیں دل پر اثر انداز ہوئی ہوں۔ ساتھ ہی یہ خدشہ بھی پیدا ہوا کہ کہیں یہی تحت شعور میں پہنچکر گل نہ کھلائیں، پاس کی ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔ پہلو میں ایک گنوار زنگروٹ اپنے پاؤں ہاتھوں کے حلقے میں لئے ہوئے اس طرح بیزار بیٹھا تھا، جیسے سوچ رہا ہو کہ نہ لڑائی ختم ہوتی ہے نہ زمینداری۔ ولندیزی قسم کے جوتے منھ کھولے ہوئے سامنے پڑے تھے، میں نے نظر بچا کر اس کے جوتوں پر توجہ ڈالی تو معلوم ہوا کہ جوتے کو گنوار کے پاؤں سے جو صدمے پہنچے تھے وہ آسام اور برما کے روڑے، کانٹوں اور حشرات الارض سے

نہ پہنچے تھے، ان کی ہمدردی میں میں نے بھی اپنے پاؤں سے جوتے موزے علٰحدہ کئے تو معلوم ہوا کہ ناخن گوشت سے جدا ہو گیا ہے، لیکن انگشت حنائی کا درد دور تک پتہ نہیں، پھٹے جوتے سے علٰحدہ کرکے جیب میں رکھے، جوتے پھر سے پہنے اور علی گڈھ جانیوالی گاڑی کی فکر میں روانہ ہوا۔ گاڑی تیار تھی، دو کیلے خریدے۔ چند دھکے کھائے۔ پلیٹ فارم پر داخل ہونے اور گاڑی پر سفر کرنے کے علٰحدہ علٰحدہ دو ٹکٹ تو پہلے سے تھے، ان کے علاوہ لڑائی کے اعزاز میں گاڑی میں داخل ہونے کے لیے کچھ لات گھونسے اور بہت سارے متفرق قسم گالی گلوچ مقرر کر دیے گئے تھے، جن کے بغیر نہ آپ ڈبے میں داخل ہو سکتے تھے، نہ اپنی نشست محفوظ رکھ سکتے تھے۔ گاڑی میں بیٹھ کر، ونگھنے لگا اور ایسا معلوم ہوا جیسے مخوی طاقتیں قیدیوں کو موت کے ڈبے میں نہیں بلکہ نزع کے ڈبے میں لیے جا رہی ہیں۔ علی گڈھ کے اسٹیشن پر گاڑی دھچکے سے رکی۔ سامنے یونیورسٹی پرائز کے نمائندے کھڑے تھے۔ فرمایا آج تانگے نہیں مل رہے ہیں۔ میں ان سے بغل گیر ہو گیا اور روندے جانے اور دوڑنے سے بچ گیا...... دوسرے دن ایک عزیز دوست کو ذاکر صاحب کی دلی سے روانگی اور اپنے متاثر ہونے کا حال لکھا اور ضمناً یہ بھی لکھ گیا کہ یہ تو ذاکر صاحب کا بمبئی کا سفر تھا جب دل کا یہ حال ہوا۔ خدانخواستہ آخری مفارقت پیش آئی اور میں موجود ہوا تو کیا عالم ہوگا۔ دوست نے اس خط کا جواب خلاف معمول جلد دیا اور لکھا، رشید صاحب۔ آپ بالکل نہ گھبرائیں۔ ایک امید یہ بھی تو ہے جس پر کہا جاتا ہے، دنیا قائم ہے کہ آپ ذاکر صاحب سے پہلے رحلت فرمائیں اور اس طرح آپ کو وہ دن دیکھنا نصیب نہ ہو جس کا آپ کو اندیشہ ہے۔ میں دوست کی اس برجستہ گوئی پر جھوم گیا، لیکن دل میں ٹھان لی کہ آئندہ تاحیات فریقین ان دوست سے اس قسم کے ازغیبی مسائل پر بالکل گفتگو نہ کی جائے گی۔"

زیر نظر کتاب میں اسی قسم کے دلچسپ واقعات سے ایک سلسلہ قائم کیا گیا ہے، جن سے ذاکر صاحب کی زندگی کے مختلف کارنامے اور ان کی شخصیت کے مختلف پہلو مثلاً ذاکر صاحب کی تعلیمی زندگی، جامعہ ملیہ کا قیام وغیرہ، سب نظر کے سامنے آ جاتے ہیں اور پھر لطف یہ کہ ذہن اکتاتا نہیں۔ افسانے کی طرح سے دلچسپی قائم رہتی ہے۔۔۔ ہاں یہ بھی نہ بھولئے گا کہ یہ کتاب انھیں حضرات کے نام منسوب ہے جو ذاکر صاحب کو فخر و محبت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

بہت ممکن ہے کہ بہت سے غیر علی گڈھی حضرات رشید صاحب کی علیگڑھیت سے گھبرائیں، لیکن وہ

اِس میں بہت کم ہے، حالانکہ اُس سے بھڑکنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں۔ ہر شخص اپنی زندگی خصوصاً اپنی جوانی جہاں گزارتا ہے، وہ جگہ کبھی نہیں بھولتا اور پھر رشید صاحب تو علی گڑھ کے اُس زریں دور کو دیکھے ہوئے ہیں، جب علی گڑھ تعلیم، تفریح اور ہنگامہ آفرینی کی ایسی گرم روایات رکھتا تھا، جو اُس وقت ہندوستان کے کسی اور ادارے میں نہ تھیں۔

جہاں تک رشید صاحب کے اندازِ بیان کا تعلق ہے وہ اس قدر معروف ہے کہ مجھے اس کے متعلق کچھ کہنا نہیں۔ ہنساتے ہنساتے غیرت اور عبرت پر مائل کر دینا، گدگدانا اور گدگدانے کے ساتھ غور و فکر پر مجبور کر دینا۔ ہنسی ہنسی کی باتوں میں بڑی دور کی کوڑی لانا، مذاق ہی مذاق میں چوٹ کر جانا، لب کو آشنائے خندہ کرنے کے ساتھ دل کو محیطِ گریہ ہو جانے کا احساس دلاتے رہنا اُن کا اپنا خاص طریقہ ہے۔ سمجھنے والوں کے لئے اِس قسم کے زوردار اور چٹکی لینے والے جملے ہمارے اس مختصر کتاب میں بھی بکثرت ہیں۔ "سمجھنے والوں" والا فقرہ میں نے اس لئے کہا کہ رشید صاحب کے اندازِ بیان سے حظ اٹھانا ادبی پرولتاریوں کے بس کی چیز نہیں۔

رشید صاحب نے اِس قسم کی خاکہ نگاری کا آغاز اصغر گونڈوی مرحوم کی سیرت نگاری سے کیا تھا، اُس سے پہلے انہیں خود بھی پتہ نہ تھا کہ اُن میں طنزیات اور مضحکات کے علاوہ یہ صلاحیت بھی خدا نے ودیعت کی ہے کہ وہ جس سے محبت یا عقیدت رکھتے ہیں، اُس کو اِس طرح پیش بھی کر سکتے ہیں کہ دوسرا بھی اُسے محبت یا عقیدت کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ رشید صاحب نے اصغر گونڈوی مرحوم پر جو مضمون لکھا تھا اُس کی مقبولیت کا اندازہ اِس سے ہو سکتا ہے کہ ملک کی ایک بڑی مقتدر ہستی نے جن سے رشید صاحب کو شرفِ دوستی بھی حاصل ہے، کچھ اِس قسم کا جملہ کہا تھا کہ "اب میرے دل میں بھی یہ خواہش پیدا ہونے لگی ہے کہ میں آپ سے پہلے ختم ہو جاؤں"۔۔۔۔ لیکن خیر شکر ہے رشید صاحب نے اپنے زندہ دوستوں کی طرف بھی توجہ کی ہے اور ہمیں امید ہے کہ اب "گنج ہائے گرانمایہ" کے بعد زمین کے اوپر کے لالہ و گل کی طرف توجہ برقرار رکھیں گے۔

آخر میں مجھے صرف یہ کہنا رہ گیا ہے کہ ہر صاحبِ ذوق آدمی کو اس چھوٹی سی کتاب کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیئے کیونکہ اس میں ہمارے اپنے عہد کے ایک بڑے صاحبِ دل کی زندگی کا خاکہ ہمارے اپنے عہد ہی کے ایک بڑے صاحبِ قلم کے طرزِ نگارش کا لکھا ہوا ملتا ہے۔

ہجرت

آغا نوری درانی

نہ پورے ہو سکے جب کفر کے ناپاک منصوبے — کہ عاجز آ چکے تھے آپؐ کی تلقین و حجت سے

کیا یہ عزم پیغمبرؐ نے شمشیر ہو جائے — یہ مشکل ہو تو قید و بند کی تدبیر ہو جائے

کیا واقف خدا نے آپؐ کو ان کے عزائم سے — کہ مکے والے انساں آج بدتر ہیں بہائم سے

یہی بہتر ہے ہجرت کر کے مکے سے چلے جائیں — مدینے کی زمینِ پاک میں جا کر سکوں پائیں

اُدھر کفار سمجھے تھے کہ مقصد اپنا پا لیں گے — درِ اقدس پہ بیٹھے تھے کہ اُس کو مار ڈالیں گے

وہ شاداں تھے محمدؐ ہم سے بچ کر جا نہیں سکتا — یہاں اس کی مدد کو آج کوئی آ نہیں سکتا

رسولِ پاکؐ نے دیکھا کھڑے ہیں خون کے پیاسے — قریشی دے رہے ہیں آ کے پہرا سامنے گھر کے

پیمبرؐ نے کلامُ اللہ کی چند آیتیں پڑھ کر — فقط اک پھونک ماری اُن ہجومِ کفر کے منہ پر

ہوئی کفار کو نورِ بصارت ہی سے محرومی — غضب کا رنگ لائی بندگانِ حق کی مظلومی

خدا کا حکم اور حد ہو چکی تھی سب مصائب کی — رسولِ پاکؐ نکلے گھر سے اور لی راہ یثرب کی

ہوئے کفار اندھے وہ انھیں کب دیکھ سکتے تھے — نکلنے والے ہیں گھر سے، وہ بیٹھے راہ تکتے تھے

کہا ابلیس نے بیٹھے ہو کیوں میرے پرستارو — نہ تم سے ہو سکا کچھ بھی جفاکارو، ستمگارو

نبیؐ تو صاف بچ کر منزلِ مقصد پہ جا پہنچے — نہ دیکھا تم نے اُن کو اور نہ کی کچھ باز پرس اُن سے

ہجومِ کفر کی تذلیل تھی تقدیر کے بس میں
حقیقت جب کھلی، کرنے لگے افسوس آپس میں

ایم، ایل، اے

ابوداؤد لکھنوی

خان عبدالغفار خاں جنھیں بادشاہ خان بھی کہتے ہیں، آل انڈیا شہرت کے مالک ہیں، ان کی حب الوطنی اور خدمت خلق کی وجہ سے چند لوگ سرحدی گاندھی کہنے لگے۔ ان کے نوجوان، ہونہار صاحبزادے خان عبدالغنی خاں سے ابھی لوگ عام طور سے واقف نہیں ہیں۔ یہ مرکزی اسمبلی کے ممبر ہیں۔ موصوف نے اپنے الکشن کے بعض گوشوں اور اسمبلی کی پہلی شرکت پر انگریزی میں ایک دلچسپ مضمون حوالۂ قلم کیا تھا۔ ناظرین تعمیر کی خدمت میں اس کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے، جس میں اجلاس کی کیفیت، اسمبلی کی نوعیت اور معزز ارکان اسمبلی کے خاص خاص کیرکٹر بصیرت افروز روشنی میں نمایاں ہیں۔

سرحد کے ایک چھوٹے سے قصبے میں شکستہ تخت کا ایک ڈائس بنایا گیا، تحصیل کے ایک مسلم لیگی جاگیردار لیڈر نے میری مدح و ثنا میں پوری قابلیت اور قوت تقریر صرف کر دی۔ خاندانی عزت و وجاہت بیان کرنے کے بعد میری غیر معمولی ذہانت و قابلیت کا دھوم دھام سے تذکرہ کیا، حالانکہ میری اس حیثیت سے وہ بالکل ناواقف تھا، اسے کچھ خبر نہ تھی کہ میری علمی قابلیت کہاں تک ہے، مجھ میں ذہانت کے جوہر بھی ہیں، اور ہیں تو کس حد تک! اس نے اپنی دھواں دھار تقریر سے لوگوں کو یہ اچھی طرح ذہن نشین کرا دیا کہ ان کے اور ان کی آنے والی نسلوں کے عروج و ترقی کا راز مجھی کو ووٹ دینے میں ہے۔ اُدھر وہ اپنی تقریر میں مست و بیخود تھا، اِدھر میں شرم سے پسینہ پسینہ ہو رہا تھا، ذمہ داریوں کا احساس مجھے پریشان کئے ڈالتا تھا، اور میں اس عالم تمنا میں تھا کہ کاش انتخاب کی مہم سر کرنے کی فکر نہ کی ہوتی۔

اس پرجوش قصیدہ خوانی کے بعد روئے سخن میری طرف پھیر کے کہا "اب میں اپنے معزز مہمان سے استدعا کرتا ہوں کہ اپنے زرین خیالات اور جواہر افکار سے ہم غریبوں کو مالا مال فرما دیں" اس کی تائید میں پہلے ایک تالی بجی پھر تمام فضا تالیوں کی آواز سے گونج اٹھی۔ لوگ ذاتی طور پر مجھ سے بہت کم واقف تھے، البتہ مشہور باپ کا بیٹا ہونے کو بخوبی جانتے تھے۔ اس لئے تقریر سننے کے کافی مشتاق تھے۔ مجھے کھڑا ہونا پڑا، میں نے مجمع پر ایک سرسری نظر ڈالی اور مسکراتے ہوئے تقریر شروع کی۔ یہ انتخابی مہم میں میری پہلی تقریر تھی،

مجھ میں اس وقت ایک عجیب قسم کا ہیجان برپا تھا، دل میں پنکھے لگے تھے۔ میرے سامنے مجمع کا مجمع تھا لیکن کوئی خاص صورت دکھائی نہ دیتی تھی، میں جو کچھ کہہ رہا تھا، اسے خود نہ سن رہا تھا، مجھے بالکل یاد نہیں ہے بک رہا تھا جنوں میں کیا کیا میں ؟

ہاں اتنا ضرور یاد ہے کہ مجمع نے متعدد بار تالیاں بجائی تھیں، اور تقریر ختم ہونے پر جس جوش و خروش سے تالیاں بجائی گئی تھیں اس سے مجھے فخر مندانہ مسرت ہوئی تھی۔

خدا خدا کر کے فیصلے کا دن آیا۔ ووٹ پڑ چکے تھے، رائے شماری ہو رہی تھی، "حریفانِ بادۂ الکشن" بے صبری سے نتیجے کے منتظر تھے، میرے دل کی دھڑکن بھی اضطرابِ عشق کے درجے میں تھی، پُرجوش ساتھیوں کی امید و بیم بھی اس میں ڈوبی تھی، مگر سب کے سب سگریٹ کے دھواں دھار کشوں میں بیقراری کی موجوں کو پریشان کر رہے تھے۔ نسبتاً مجھے اپنے مدمقابل سے زیادہ سکون تھا کیونکہ اس کے پولنگ ایجنٹ کا سرخ چہرہ، پژمردگی میں زرد زرد ہو رہا تھا۔ "کارِ شمار" آخرکار ختم ہوا۔ پولنگ افسر ایک انگریز تھا، اس نے مبارکباد دیتے ہوئے مجھ سے ہاتھ ملایا، دل کی دھڑکن نے سکون کا پہلو پایا، حریفوں کے رنگِ رخ کی طرح ہاتھوں کے طوطے بھی اُڑ گئے۔ سراسیمگی کے عالم میں مجھے رسمی مبارکباد دینا بھی بھول گئے، مگر معاً سنبھلے، فراخدلی کا مظاہرہ کیا اور آگے بڑھ کے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ ان ہاتھ ملانے والوں میں مسٹر عبد الرب نشتر بھی تھے۔

مجھے ایک انبوہِ کثیر نے گھیر لیا، مجمع میں بلا کا شور تھا، ہر شخص جوشِ مسرت سے چیخ رہا تھا، میری پیٹھ بے تحاشا ٹھونکی جا رہی تھی، جن سے میرا کسی قسم کا تعارف نہ تھا، وہ بھی بڑی بے تکلفی سے پیش آ رہے تھے۔ میرا چھوٹا بھائی خوشی سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ میں کامیابی سے پہلی بار ہمکنار ہوا تھا اور عوام کے جذبات کو (جو پرستش کی حد تک پہنچ گئے تھے) دیکھ رہا تھا۔ مجھے سر پر بٹھا کے پشاور کی سڑکوں اور گلی کوچوں میں گھمایا گیا، میری شان میں دیوانہ وار نعرے لگائے گئے۔ اس لذت کے باوجود جو مجھے مل رہی تھی، میں اپنے کو واماندہ و افسردہ پا رہا تھا۔ شہر کے صدر مقام پر ایک میموریل ہال میں یہ جلوس جلسے کی شکل میں تبدیل ہو گیا۔ ایک پرجوش ورکر نے کھڑے ہو کر ووٹ دینے والوں کا شکریہ ادا کیا۔ اپنے حریفوں کو برا بھلا کہا، پولنگ افسروں کی بے عنوانیوں، جنبہ داریوں کا رونا رویا، پھر مجھ سے شکریہ ادا کرنے کی فرمائش کی۔ میں نے اپنے ہمدردوں، ورکروں، ووٹروں کا جوش و خروش سے شکریہ ادا کیا۔

سادہ دل ووٹ دینے والے ایسے خوش خرم نظر آتے تھے کہ گویا ان کی، ان کے بچوں کی، آنے والی

نسلوں کی فارغ البالی وخوش حالی مجھی کو ووٹ دینے پر موقوف تھی۔ میں نے ان کی اخلاص مندانہ آنکھوں اور محبت افروز جذبات کو دیکھ کر دل میں عہد کیا کہ کوئی کام کبھی ایسا نہ کروں گا جس سے ان آنکھوں کی معصومانہ چمک اور ان جذبات کی پُرامید جھلک ندامت و افسوس کے دھندلکے میں ماند پڑ جائے۔ میں نے طے کیا کہ ہمیشہ ان سے محبت و مہربانی کا برتاؤ کروں گا اس لئے کہ وہ مجھ پر بھروسہ کرتے ہیں، میں نے عزم کیا کہ ان کی خدمت جان و دل سے کروں گا، اس لئے کہ وہ مجھ سے یہی توقع رکھتے ہیں۔ انھیں مایوس و دلگرفتہ کرنا ایسا گناہ ہے، جو مجھے کبھی کرنا نہ چاہئے۔ عہد طفلی کے ایک دوست کے ساتھ میں نے رات بسر کی۔ وہ کھانا کھانے میں اور کھانے کے بعد بھی اپنے کارنامے مزے لے لے کر بیان کرتا رہا۔ اس نے بتایا کہ وہ کن کن تدبیروں اور حکمت عملیوں سے ووٹ حاصل کرتا رہا اور اس کے خسر کی معزز ذی اثر ذات سے کس قدر فوائد ہوئے۔ دبی زبان سے یہ خواہش بھی ظاہر کی کہ اس کے معزز خسر کو کوئی اچھا منصب دلا دیا جائے، اور سنجیدگی سے ہدایت کی کہ اب مجھے اپنی پوزیشن کے اعتبار سے کس کے ساتھ کیسا برتاؤ کرنا چاہئے۔ اس نے اخلاص، محبت سے یہ بھی مشورہ دیا کہ موقع سے فائدہ اٹھا کر احباب کو بام ترقی پر پہنچانے میں کوتاہی نہ روا رکھنا چاہئے، میں نے دل ہی دل میں کہا کہ ترقی اور مدارج ترقی آپ کی بیوی صاحبہ کے حسب مراد اور خسر صاحب کے شایان شان ہونے چاہئیں اور بات ٹالنے کے لئے، اپنے پرانے اسکول ماسٹر کا قصہ یوں چھیڑ دیا:

"رات کو میں سویا تو ماسٹر صاحب کی آواز کانوں میں گونجتی رہی۔ میں نے دیکھا کہ میں ایک خچر ہوں اور دنیا بھر کی خوشامدانہ التجائیں میری گھائل پیٹھ پر سوار ہیں۔ ایک طرف تو ان کے بوجھ سے کمر ٹوٹی جاتی ہے، دوسری طرف ان کی بجیں غریب آزاری سے گھائل پیٹھ اور زخمی ہوتی چلی جاتی ہے، صبح آنکھ کھلی تو دیکھا کہ میں مرکزی اسمبلی کا باقاعدہ ممبر ہوں"

اسمبلی کا پہلا دن

ابھی تک زندگی میں مجھ پر ایسے تین وقت گذرے ہیں، جن میں ایک ہی حالت کارفرما رہی ہے۔ ایک اسکول میں امتحان کے وقت، دوسرے شادی کے وقت، تیسرے پہلے پہل اسمبلی جاتے وقت۔ ان تینوں موقعوں پر میں کچھ گھبرایا گھبرایا اور شرمایا شرمایا سا تھا۔ میری نشست کے بعد حزب مخالف کی سیٹیں تھیں۔ میرے پاس جو صاحب تشریف فرما تھے، وہ ضرورت سے زیادہ خشک اور خود دار معلوم ہوتے تھے، جب پہلے دن کی گھبراہٹ اور شرماہٹ نے میرا پیچھا چھوڑا تو یہ غیر دلچسپ اور تھکا دینے والی فضا شاق گذرنے لگی۔

میں سیٹ بدل کر مسٹر مینو مسانی کے پاس جا بیٹھا۔ ان کے نام نامی سے پہلے ہی واقف تھا، اُن کی بے تکلف بڑی بڑی آنکھیں اجنبیت سے دور تھیں، امید کے موافق وہ نعم القرین (اچھے ساتھی) ثابت ہوئے ــــ مسٹر مسانی ایک خوش مزاج، تیز طبع، ذہین اور معاملہ فہم آدمی ہیں، تحریر و تقریر کے ساتھ ساتھ ہنسنے کی اہلیت بھی رکھتے ہیں۔ دوسری طرف مسز آموسوامی ناتھن تشریف رکھتی تھیں۔ یہ ایک ہمدرد قسم کی خالص ہندوستانی خاتون ہیں۔ اِن کے تعارف میں اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ آزاد ہند فوج والی کرنل لکشمی کی والدہ ماجدہ ہیں۔ کرنل لکشمی ہندوستانی حب الوطنی کی خاص پیداوار اور بامِ شہرت پر جلوہ بار ہیں۔

سامنے کی نشست پر مسٹر اننداسیانم آئنگر بیٹھے تھے، وہ ایک صاف گو بحثت والے شریف، ہمدرد آدمی ہیں۔ کڑوی سے کڑوی بات اس اخلاص اور سیدھے سادے طریقے سے کہتے ہیں کہ ناگوار نہیں ہوتی، ان کی طبیعت فرشتوں کی سی ہے اور لب و لہجہ مدراسی۔ میرے مشاہدے میں پہلے مدراسی ہیں جن کی آنکھیں نیلی اور مزاج ظریفانہ ہے، ان کی پیشانی پر تلک تو ضرور جگمگاتا ہے، مگر روح عیسائیت میں ضرور ہے۔

سرکاری بنچوں پر سب سے پہلے نظر سر عزیز الحق[1] اور ڈاکٹر امبیدکر پر پڑی، دونوں طبلے کی جوڑی بنے برابر بیٹھے تھے، باہم ایک کو دوسرے سے تمیز کر لینا آسان نہ تھا۔ ان کے داہنی طرف سر اڈورڈ بینتھل تشریف فرما تھے، مارکھائے ہوئے بچے کی طرح رونی آواز میں ہکلا ہکلا کر بولتے اور دانت پیستے تھے۔ جب سرت چندر بوس کو جواب دینے کی کوشش کرتے تھے تو ان کی حالت زار اور زیادہ قابل الرحم ہوتی تھی۔ انھیں دیکھ کر میرے سامنے بے اختیار وہ منظر آگیا، جب میری ممی کی پیالی ایک تشتری ٹوٹ جانے پر ماں کی گھڑکیوں کا تُتلا تُتلا کر جواب دے رہی تھی۔ سرت چندر بوس، جیسا کہ بنگالیوں کی عادت ہے، جوش میں آکر اس طرح تقریر کر رہے تھے کہ اپنے حزب مخالف کے لیڈر ہونے تک کو گویا فراموش کئے تھے۔

سر بینتھل کے بعد ممبر قانون کو ئی ..... راؤ تھے قانون میں ان کی قلبی قابلیت تھی، آنکھیں بڑی، لمبی ان کی ناک تھی۔ میں تو نہ سن سکا کہ انھوں نے کیا فرمایا تھا۔ ان کا لب و لہجہ کانوں میں گونج رہا ہے۔ آواز بلند تیز مگر خفیف تھی، تقریر سننے کی ہر چند کوشش کی سوا آواز کے کچھ نہ سنائی دیا۔

---

[1] افسوس کہ سر عزیز الحق پر فالج کا حملہ ہوا اور ۲۲ مارچ ۱۹۴۷ء کو انتقال فرما گئے۔ ۱۹۴۲ء میں ہندوستان کے ہائی کمشنر لندن میں رہے ۱۹۴۶ء میں وائسرائے کونسل کے رکن مقرر ہوئے۔ اس سے پہلے بنگال کے وزیر تعلیم، کلکتہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور بنگال اسمبلی کے اسپیکر رہ چکے تھے مسلم لیگ کی تحریک پر گذشتہ سال انھوں نے بھی سر کا خطاب واپس کر دیا تھا۔

سر ہے۔ پی کو پہلے قحط بنگال کے مباحثے میں دیکھا تھا، اب یہاں قحط مدراس کے سلسلے میں دوبارہ شرف زیارت حاصل ہو رہا ہے۔ کوٹ کے کاج (بٹن ہول) میں ایک سرخ گلاب کا پھول زینت افزا تھا، اپنے آپ پر مسرور و نازاں ہونے کے ساتھ قحط پر بھی خوش خرم معلوم ہوتے تھے، ہکلاتے وہ جاتے تھے، سراپا میں جانا تھا، انھیں خود کوئی احساس نہ تھا، ڈبل برسٹ کوٹ میں تن و توش خوب نمایاں ہو رہا تھا۔ وہ (ہم سوالات کا جیب جواب دیتے تو حیرت کے ساتھ اس سنگدلی پر غصہ بھی آتا تھا کہ "ممبر خدا" قحط کے ذکر و مباحثے میں ظرافت کا پیوند کیوں لگا رہا ہے۔ غربت و قحط کے موضوع پر بذلہ سنجی سنگدلی نہیں تو کیا ہے!

محکمۂ سپلائی کے سکریٹری مسٹر واکر ایک چھوٹے سے قد کے آئی۔ سی۔ ایس ہیں۔ سر وانٹیل کی طرح ان کی بھی ایک آنکھ بڑی اور ایک چھوٹی ہے۔ تقریر منطقی ہوتی ہے، بات متانت سے زور دے کے کہتے ہیں اور کامیاب ہوتے ہیں، کامیابی کا راز ان کی غیر متوازی آنکھیں ہیں، جو ایک ہی وقت میں، دو مختلف جذبوں کی ترجمان نظر آتی ہیں، ناظرین کو صحیح اندازہ مشکل ہوتا ہے کہ اصلی جذبہ کیا ہے، ایک آئی سی۔ ایس کے تمام محاسن ان کی ذات ستودہ صفات میں پائے جاتے ہیں۔ کم سے کم کام پر زیادہ سے زیادہ داد حاصل کر لینے کی خاص صلاحیت رکھتے ہیں۔ جب تک ان کے سامنے دفتری منازل طے کرنے کے بعد تحریری رپورٹ پیش نہ کی جائے اُس وقت تک کسی امر سے واقف نہیں ہو سکتے۔ موصوف نے اپنی تقریر میں ہر ایک بات پر خندہ جبینی سے "غور کرنے" اور ہر معاملے کی "تحقیقات کرنے" کا وعدہ فرمایا۔

سرکاری ممبروں میں سب سے زیادہ بھلا جو معلوم ہوتا تھا وہ سر اکبر حیدری تھے۔ ان میں ایسی ذہانت اور طبعی ظرافت پائی جاتی ہے کہ کوئی انھیں پسند کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ان کی غمگسار اور کرم بار آنکھوں میں وہ حلاوت ہے کہ اگر کوئی سخت و تلخ بات بھی فرمائیں تو ناگوار نہ ہو گی۔ پستہ قامت، بلند خیال، گھونگھر والے بال، چہرہ پر بشاشت، لبوں پر مسکراہٹ، وہ اسمبلی بھر میں ایک اکیلے انسان ہیں، جو دوسروں پر خندہ زن ہونے کے ساتھ خود اپنے پر بھی ہنسنے میں فراخدل ہیں۔ وائسرائے کونسل کے ممبر ہونے کے باوجود ایسے شریف النفس، حقیقت آشنا انسان ہیں کہ انھیں یہ غلط فہمی نہیں کہ ان کی صورت، روڈولف ولنٹانیو ایسی ہے اور ان کا دماغ سقراط کے مثل ہے۔

پریس گیلری اسمبلی کا سب سے زیادہ مضرت رساں حصہ ہے۔ آنریبل ممبر اکثر و بیشتر اپنا اور ایوان دونوں کا بڑا وقت اس کے خاطر ضائع کرتے رہتے ہیں تاکہ ووٹ دینے والوں پر یہ برابر واضح ہوتا

کہ ان کا نمائندہ واقعی ان کے ووٹوں کا صحیح حقدار ہے۔ ان کی تقریریں موضوع بحث پر بہت کم ہوتی ہیں، اِدھر اُدھر کی باتوں سے ایوان کی فضا بھری رہتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اصلی مخاطب پریس والے ہیں، دل کی لگن یہ ہے کہ تقریر ملک بھر میں شائع ہو اور لوگ سمجھیں کہ ہمارے نمائندہ ممبر صاحب ہمارے ہمدرد و بہی خواہ ہیں۔ اگر پریس والے ایوان میں نہ ہوں تو یقین ہے کہ پچاس فیصدی تقریریں کم ہو جائیں، سو فیصدی تقریروں کی طوالت ختم ہو جائے اور تقریروں کا معیار دو سو فیصدی بلند ہو جائے۔ ہاں یہ بھی صحیح ہے کہ بعض ممبر تقریر کرنے پر مجبور ہیں جیسے رانگا اور صدیقی گمران کی مثال مستثنیات میں سے ہے۔

یہ بات اچھی طرح سے سمجھ لینا چاہیے کہ اسمبلی کا ممبر ہونا قسمتوری نہیں ہے۔ اسے بڑی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، مہینوں دو بجے سے پانچ بجے تک خشک و بے مزہ تقریریں سُننی پڑتی ہیں۔ ایک لائق ممبر بننے کے لئے ضروری ہے کہ تقریروں کے اوقات میں اونگھنے کے فن لطیف کا برجستہ استعمال کرتا رہے، خالی سیٹوں اور اونگھتے ممبروں کے سامنے جوش خروش سے تقریر کرتے رہنے میں بھی مشاق ہو، پریس والوں کو محفوظ کرنے، پارٹی لیڈر کو دُم ہلا ہلا کے خوش رکھنے کے گر بھی جانتا ہو، عام پسند قراردادوں کو انتخاب کرنے اور تقریر کی اجازت حاصل کرنے کے لئے پارٹی وھپ کو پھُسلانے بہلانے کا ملکہ راسخہ بھی رکھتا ہو۔ ایک کامران ممبر بننے کے لئے اس دستور کا جاننا لازمی ہے کہ ایوان میں عوام کی غربت اور مخلوق کی خالی پر ایسی تقریر کرے کہ لوگوں کی آنکھیں پُرنم اور دل بیتاب ہو جائیں۔ ایوان کے باہر اپنے ملنے والے، حاجت روا، طبقۂ امراء کی شاندار دعوت کرنے اور انھیں راضی رکھنے میں بھی ماہر ہو۔ ایک مسلّمہ شدہ اصول کے طور پر تسلیم کر لینا چاہیے کہ اسمبلی کے اندر بھی دنیا کے دیگر شعبوں کی طرح محض سچائی اور ایمانداری سے کامیابی ٹیڑھی کھیر ہے، بغیر مکر و فریب کے یہاں بھی کام نہیں چلتا۔ " الدنیا نر دڑلا یحصلها الّا الزوذ؟ (دنیا سراپا مکر ہے اور اسے آدمی مکر ہی سے حاصل کر سکتا ہے)۔

آنریبل ممبر کو اس وقت بڑا مزا آتا ہے، جب اس کی تنقید و گرفت پر متانت کے ساتھ زوردار بحث کی جاتی ہے، اور غصہ اس وقت بہت آتا ہے جب کوئی ممبر دورانِ تقریر میں تو مزے سے خراٹے لے رہا ہوتا ہے اور تقریر ختم ہونے پر گرم جوشی سے ہاتھ ملا کر داد و تحسین کی بوچھار کرتا ہے۔

ہیرو : ۔ ایوان اسمبلی کا ہیرو صدر ہوتا ہے۔ تمام مصائب کا سامنا اسی کو کرنا پڑتا ہے۔ اطالی اور بیکار تقریروں کو تمام و کمال غور سے سُننا پڑتا ہے۔ ایک ذہین و لطیف مزاج کے لئے اس سے بڑھ کے

اور کیا تکلیف دہ ہوسکتا ہے کہ بیہودہ تقریروں اور احمقانہ باتوں کو صبر وسکون سے لگاتار سنتا رہے۔

میں جانتا ہوں کہ صدر محترم ایک ذہین وتین انسان ہیں۔ انھیں ایک معزز ممبر کی بے معنی و مہمل تقریر پانچ گھنٹے تک بار بار غور وخوض سے سننا پڑی۔ اندیشہ کیا بلکہ یقین ہے کہ اس مصیبت کبریٰ کو پوری قوتِ تحمل سے برداشت کرلینے کی وجہ سے چند بال دو سفید ہوگئے ہوں گے۔ وہ خشک، بیہودہ، مہمل تقریر سن کر میں غصے سے بے قابو ہوگیا، جس کے لئے عوام کی کمائی کا روپیہ چھ ہزار یومیہ کے حساب سے خرچ ہوتا ہے (مرکزی اسمبلی کے ممبروں پر اتنا ہی روپیہ روزانہ صرف ہوتا ہے) عدم تشدد کا قائل وحامی ہونے کے باوجود بے چین دل کا تقاضا تھا کہ مقرر صاحب کے سر اقدس پر کوئی بھاری چیز دے ماروں کہ ایوان کو اس بکواس سے نجات مل جائے، مگر اسمبلی کے قواعد وضوابط نے باز رکھا، مجبور وعاجز ہو کے باہر چلا گیا۔ دکھیارے صدر کو مسلسل پانچ گھنٹے تک صبر وسنجیدگی سے اس عذاب کو برداشت کرنا پڑا۔

ایسی مصیبتوں کا سامنا آئے دن کرنا پڑتا ہے۔ یہاں اکثر وبیشتر تقریریں خشک، بے مزہ اور تھکا دینے والی ہوتی ہیں۔ ان میں نہ تو کوئی نئی، دلچسپ بات ہوتی ہے، نہ کوئی دلکش نقرہ۔ پریس اور مشیر ال والوں کی نظروں میں رسوخ ومنزلت حاصل کرنے کے لئے جو منھ میں آئے کہتے چلے جانا ضروری ہوتا ہے۔

اسمبلی کی کارروائی خود تو خشک و بے مزہ ہوتی ہے، مگر اپنی اندر پروپگنڈے کا بڑا کارآمد مواد رکھتی ہے، اور اس میں کافی استعمال کی جاتی ہے۔ ملک کو اسمبلی سے اس سے زیادہ امید بھی نہ رکھنا چاہیے، جب بہترین قانون شکن، قانون سازی کے لئے جمع ہوں گے تو اس کا قدرتی نتیجہ یہی ہوگا۔ اسمبلی کے جو ممبر عمر طبعی کی سرحدوں کو پار کرچکے ہیں، انھیں قانون سازی سے زیادہ دوا سازی سے مناسبت ہے۔ اکثر آنریبل ممبر اجلاس میں سکون کے ساتھ استراحت فرماتے رہتے ہیں، جب تک پارٹی کا وہپ ہاتھ اٹھانے کے لئے شانہ پکڑ کر ہلا نہیں اُس وقت تک خوابِ ناز سے بیدار نہیں ہوتے۔

ممبران کی ذہانت کا معیار چنداں بلند نہیں، برتاؤ اور رکھ رکھاؤ کا جہاں تک تعلق ہے اس کے متعلق کچھ کہنے سے نہ کہنا ہی بہتر ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ ممبر اس لحاظ سے تو منتخب ہوکے آتے نہیں تو سوال یہ ہے کہ آخر پھر کس معیار پر ان کا انتخاب عمل میں آتا ہے؟

عارضی حکومت

عارضی حکومت کے بعد سے اسمبلی کی فضا اور زیادہ خشک ہوگئی ہے۔ مجھے جواہر لال نہرو پر اعتراض کرنے کی

اتنی بھی اجازت و گنجائش نہیں، جتنی رنگا گورا جہ جی کے اور صدیقی کو لیاقت علی خاں کے پریشان کرنے کی ہر وقت حاصل رہتی ہے۔ اب اسمبلی کے ممبر کو بچوں کی طرح ادب سے بیٹھنے اور سعادتمندی سے خاموش رہنے کی اشد ضرورت ہے، ورنہ اُسے اسمبلی سے باہر نکل آنا چاہیے۔ میں اپنے لیے باہر چلا آنا زیادہ پسند کروں گا، اسمبلی میں تقریر کرنے کی بہ نسبت اپنے گھوڑے سے باتیں کرنے میں مجھے زیادہ مزہ آتا ہے۔ مگر تم تو یہ ہے کہ تقریر بھی نہ کیجیے اور مہذب بنے چپکے بیٹھے رہیے، یہاں تک کہ پاؤں بھی نہ ہلے ورنہ ممبران کرام کو ناگوار ہوگا۔ جب ہاتھ اٹھانے کا وقت آئے تو متانت سے ہاتھ اٹھا دیجیے، اور پھر بدستور بت بنے بیٹھے رہیے۔ جب کوئی ممبر تقریر کر رہا ہو تو انگلیاں تک نہ چٹخائیے، انگڑائی تک نہ لیجیے کہ خلاف آداب مجلس ہے۔ جب سردار پٹیل ڈرانا چاہیں تو خوف زدہ نظر آنے لگیے۔ جب راجہ جی قائل کریں تو اولاد ایسے اپنے قائل ہونے کا ثبوت پیش کرتے رہیے۔ اگر آپ سردار صاحب کو یہ توجہ دلانا چاہیں کہ اسمبلی کا اجلاس احمد آباد میونسپل بورڈ کا جلسہ نہیں ہے اور یہاں وہاں کا سا طرز عمل بے محل ہے تو جواب میں فرما دیا جائے گا "کیوں؟" اس "کیوں" پر آپ کو خردانہ انداز اور سعادتمندانہ مسکراہٹ سے سر تسلیم خم کر دینا چاہیے۔ ایوان میں قانون سازی کا کام بھی ہوتا ہے، مگر نوعیت اس کی ضمنی ہوتی ہے۔ ترمیمیں، ترمیموں پر ترمیمیں، سوالات، سوالات پر سوالات، قانونی نکات و اعتراضات، بال کی کھال، غرضکہ یہ تمام سلسلہ وار امور بطور شغل کے کیے جاتے ہیں۔

واقعی اگر ہندوستان کے تعمیر کرنیوالوں کو دیکھنا ہے تو ان کاغذات بدست ممبروں کے دیدار نمائش آثار میں اپنا وقت نہ گنوانا چاہیے، بلکہ کھیتوں کی فضا اور محنت و جفاکشی کی آب و ہوا میں جاکر خاک آلود، پسینے میں شرابور کسان کو دیکھ لینا چاہیے۔ اسمبلی کے قانون ساز ممبر انہیں کچھ تعلیم دینے کے بجائے ان سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ اس وقت وہ شخص جو سیر بھر غلہ بھی پیدا کرتا ہے اُس شخص کی بہ نسبت جو خشک قانون کے انبار لگاتا ہے، بھوکے ہندوستان کے لئے زیادہ مفید و کارآمد ہے۔ تعمیر ہندوستان میں قانون سازوں سے اس کا ہاتھ کہیں زیادہ ہے۔ فی الحال ملک کو غذا کی بہت ضرورت ہے اور قانون کی بہت کم۔ قوم کی زندگی محض قانون کے سوکھے ٹکڑوں اور دلچسپ تقریروں پر بسر نہیں ہو سکتی۔ میں آپ کے اُس خواب شیریں میں خلل انداز نہیں ہونا چاہتا، جو آپ اسمبلی کے بارے میں دیکھ رہے ہیں کہ وہ ایک ایسا جمہوری ادارہ ہے جس میں عوام کے مفاد کی ترجمانی ہوتی ہے۔ جمہور کی خواہش کے مطابق کام ہوتا ہے۔ اسی نقطۂ نظر سے مادرِ ہند کے سپوت قانون سازی کے محترم کام میں سرگرم رہتے ہیں۔ مجھے اس مزیدار خواب پر رشک آتا ہے، کاش میں بھی اسمبلی کا ممبر نہ ہوتا اور آپ کی طرح اس کے مزے لوٹتا۔

نا داری و فاقہ مستی

ابرار حسنی گنوری

چھپائیں لاکھ، ناداری مسلّم ہوتی جاتی ہے
وطن کی سرزمیں اب تو جہنم ہوتی جاتی ہے

فسانہ جس قدر ہم اپنی بربادی کا کہتے ہیں
حکومت اس قدر ہی اور برہم ہوتی جاتی ہے

جہاں لنگر لٹا کرتے تھے عیدیں رقص کرتی تھیں
وہاں فاقوں سے ہر ساعت محرم ہوتی جاتی ہے

گدائی کے لئے نکلے ہیں عزت دار تنگ آکر
قیامت ہند میں شاید مجسم ہوتی جاتی ہے

وہ بچہ، جو زمیں پر گر پڑا روٹی نہ ملنے پر
(ق) نقاہت زور پر ہے آنکھ پُرنم ہوتی جاتی ہے

وہ بیوہ ماں اُٹھا کر گود میں بچہ کو چیخ اُٹھی
کئی فاقوں سے خود جس کی کمر خم ہوتی جاتی ہے

برابر تنگ ہوتے جاتے ہیں حلقے غلامی کے
برابر مفلسی ہر سو مسلّم ہوتی جاتی ہے

پسینہ فاقہ کش جتنا بھی محنت میں بہاتے ہیں
مصیبت اور محکم اور محکم ہوتی جاتی ہے

سلاطیں زادے، اور ٹھیلے گھسیٹیں پیٹ کی خاطر
یہ کیا حالت، بتا ربِ دو عالم ہوتی جاتی ہے

غضب ہے جورِ حیوانی، ہیں انسانوں پہ انساں کے
قیامت ہے، قیامت قدِ آدم ہوتی جاتی ہے

ذرا صیاد آنکھیں کھول، دے درسِ وفا ان کو
نظر تیری جفائیں اب تو حاکم ہوتی جاتی ہے

کہیں ایسا نہ ہو تیرا نشیمن بھی اُجڑ جائے
کہیں ایسا نہ ہو یہ رنگِ محفل سب بگڑ جائے

علاجِ فاقہ یادِ دورِ راحت سے نہیں ہوگا
علاجِ فاقہ کمزوری سے دہشت سے نہیں ہوگا

"ہم ایسے ہیں ہمارے تاجدار اسلاف ایسے تھے"
علاجِ فاقہ اس رنگیں حکایت سے نہیں ہوگا

مرصّع کرسیوں پر قہقہے، میزوں پہ ساغر
علاجِ فاقہ دورِ جامِ عشرت سے نہیں ہوگا

کلائی میں گھڑی، رومال سر پر، ہاتھ جیبوں میں
علاجِ فاقہ اس ناز و نزاکت سے نہیں ہوگا

جو سر قدموں پہ جھکتے ہیں وہ سر جھک کر لئے جاتے ہیں
علاجِ فاقہ ذلت خیز اطاعت سے نہیں ہوگا

سب اک منزل کے رہرو، پھر جدا راہیں جدا چالیں
علاجِ فاقہ اس تفریق و نفرت سے نہیں ہوگا

سرِ غدار ہوتا ہے قلم تاریخ شاہد ہے
علاجِ فاقہ اس ناپاک سیرت سے نہیں ہوگا

نا داری و فاقہ مستی - شاعر

گدا کی داستانِ درد افزا کون سنتا ہے — علاجِ فاقہ اظہارِ مصیبت سے نہیں ہوگا
سرِ ممبر کہاں تک روز آتش بار تقریریں — علاجِ فاقہ اِس خونیں خطابت سے نہیں ہوگا
بہایا جائے خون پر خون، پھونکے جائیں گھر ناحق — علاجِ فاقہ اِس اندازِ وحشت سے نہیں ہوگا
جب اپنے گھر کی دولت اپنے گھر تم رکھ نہیں سکتے — علاجِ فاقہ بیگانہ حکومت سے نہیں ہوگا

علاجِ فاقہ کو ہمت کی، طاقت کی ضرورت ہے
رواداری کی حاجت ہے، محبت کی ضرورت ہے

حضرت کیف بھوپالی

مرے شعر سے ارتقا جاگتا ہے
خودی جاگتی ہے خدا جاگتا ہے
صبا جاگتی ہے، کلی جاگتی ہے
ہر اک شے بخفی و جلی جاگتی ہے
غلامی کے اعضا میں خوں دوڑتا ہے
خرد کی رگوں میں جنوں دوڑتا ہے
مرا شعر بجلی، مرا شعر بادل
دھماکا، گرج، گونج، طوفان، ہلچل
مگر ایک بھوپال ــــ اب تک نہ جاگا
یہ مفلس یہ کنگال ــــ اب تک نہ جاگا

بھوپال کی علمی ادبی روایات

کوثر چاندپوری

ہندوستان کے نقشے پر اسلامی ریاستیں چند منتشر نکتوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں، ہم ان نکتوں کو حیدرآباد، بھوپال، رام پور اور بہاولپور سے موسوم کرسکتے ہیں مگر عجیب حسن اتفاق ہے کہ ان ریاستوں کی تاریخ نہایت روشن ہے اور اس میں دائرے کی سی وسعت اور سارے ہندوستان پر محیط ہو جانے کی طاقت موجود ہے، علوم و فنون کی بڑی بڑی داستانیں ان سے وابستہ ہیں۔ ریاست حیدرآباد نے قرطبہ و بغداد کی عظمت کو جگا دیا ہے۔ رام پور کی تاریخ بھی اس لحاظ سے ہمیشہ شاندار رہی ہے۔ قائم چاندپوری اور غالب کے تعلق نے اس میں کچھ اور تنویریں بھر دی ہیں۔ بہاولپور نے بھی معارف پرستی کے ذیل میں بہت کچھ کیا ہے۔

بھوپال بندھیاچل کی اونگھتی ہوئی ویران پہاڑیوں کی گود میں، ایک ایسا حسین بچہ ہے جس کے تیوروں سے شباب و جوانی کے ہنگامے جنم لیتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ یا سوئے ہوئے اس ماحول میں وہ فطرت کی ایک ایسی انقلاب انگیز انگڑائی ہے، جو رگوں اور پٹھوں میں بیداری کے ہزاروں طوفان بھر دیتی ہے۔ درحقیقت وہ ایک ایسے نوجوان کا خواب حسین ہے، جو صرف بیدار ہونے کے لئے سویا ہو اور بیداری کے پہلے ہی لمحے میں خواب کی تعبیریں مجسم ہو کر اس کے سامنے آنے لگیں۔

گذشتہ سو سال میں بھوپال نے بڑے بڑے اہل علم پیدا کئے جو نہ صرف بھوپال بلکہ کل عالم اسلام کے لئے مایۂ افتخار ثابت ہوئے۔ نواب صدیق حسن خاں مرحوم اپنی کثیر تصانیف اور دوسرے علمی و عملی کارناموں کے باعث لازوال شہرت کے مالک ہیں۔ اسی طرح مولانا سید ذوالفقار احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے مخصوص تبحر کی بنا پر روشناس عالم ہیں۔ اور علامہ شیخ حسین عرب کی عظمت اُن بیشمار تلامذہ سے ظاہر ہوسکتی ہے جو ہندوستان کے ہر گوشے میں ایک تناور درخت کی شاخوں کے مانند پھیلے ہوئے ہیں۔ موجودہ فرمانروا سے پہلے یہاں کی زمام حکومت بیگمات کے ہاتھوں میں رہی، جو ملک داری اور جہانبانی کی تمام خصوصیات کے ساتھ ساتھ علمی و ادبی ذوق سے بھی بہرہ مند تھیں یہی وجہ ہے کہ یہاں ہر عہد میں ارباب علم کا قابل رشک مجمع رہا۔ نواب شاہجہان بیگم صاحبہ کو فطرت نے شعر و سخن کا نہایت پاکیزہ مذاق عطا کیا تھا، ان کا ایک مکمل دیوان بھی موجود ہے، جو اُس زمانے کے شعری اور ادبی رجحان کا پتہ دیتا ہے۔

نواب شاہجہان بیگم صاحبہ کے اسی ذوق کا نتیجہ تھا کہ سرزمین بھوپال شعر و سخن کا مرکز بن گئی تھی۔ سراج میر خاں سحر

منشی معشوق علی نماں جوہر اور منشی جمیل احمد جمیل سہسوانی اسی دور کی روشن شمعیں تھیں، اس کے بعد نواب سلطان جہان بیگم صاحبہ اورنگ حکومت پر متمکن ہوئیں۔ یہ اپنی مخصوص دماغی استعداد کے باعث اپنے وقت کی رضیہ سلطانہ تھیں۔ بھوپال نے صرف علمی و ادبی حیثیت سے بلکہ سیاسی، اقتصادی، اور تمدنی و معاشی اعتبار سے بھی اس روشن دماغ، اور بیدار فطرت بیگم کے عہد حکومت میں زبردست ارتقائی مراحل طے کئے۔ نواب سلطان جہان بیگم صاحبہ کو امور جہانبانی اور آئین ملک داری میں ایک عجیب و عجیب دستگاہ حاصل تھی، اور حکمرانی کے نہایت اعلیٰ اوصاف قدرت نے انھیں عطا کئے تھے۔ ملک میں ہر طرف امن و امان تھا، مدارس اور شفا خانوں کا جال پوری مملکت میں بڑے سلیقے سے بچھا دیا گیا تھا، جبری تعلیم کا نظام بھی نافذ کر دیا گیا تھا، عہد سلطانی کے برکات آسمان بھوپال پر نقش مستقل بن کر چمکے، دار السلطنت میں مختلف مذہبی، طبی درسگاہوں کا افتتاح عمل میں آیا، بیرون ملک کے بڑے بڑے دار العلوم بھی بھوپال کی فیاضانہ امدادوں سے فیض یاب ہوئے۔ جدید علوم کی روشنی بھی ملک میں داخل ہوئی، چند رسائل جاری ہوئے۔ قیصر بھوپالی نے "الحجاب" اور مولوی محمد امین زبیری نے "ظل السلطان" نکالا، جن میں عورتوں کی حمایت میں بہت کچھ لکھا گیا۔ اس کے بعد نیاز فتحپوری نے جو اس وقت دفتر تاریخ سے متعلق تھے، رسالہ "نگار" جاری کیا۔ حمیدیہ لائبریری کے نام سے ایک عظیم الشان کتب خانہ جدید نظام کے ساتھ وجود میں آیا، جس میں جدید و قدیم کتب کا زبردست ذخیرہ تھا۔ سیاسی و قومی تحریکات نے بھی، جو اس وقت تک ریاستی باشندوں کے لئے شجر ممنوعہ کا حکم رکھتی تھیں، حدود مملکت میں بار پایا۔ چنانچہ خلافت اور ترک موالات کی تحریک بڑے شد و مد سے چلی اور ملک کے اکثر حضرات نے پوری بیباکی سے اس میں حصہ لیا۔ مسیح الملک حکیم اجمل خان اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری کو بھوپال سے خاص تعلق رہا اور موجودہ فرمانروا سے جو اس وقت چیف سکریٹری کی حیثیت سے جہانبانی کی تربیت حاصل کر رہے تھے، ان حضرات کے مخلصانہ روابط قائم رہے۔ اس کے ساتھ خود نواب سلطان جہان بیگم صاحبہ تصنیف و تالیف کا بڑا ستھرا ذوق رکھتی تھیں، انھوں نے متعدد کتابیں تصنیف و تالیف کیں، جو آج بھی ان کی دماغی و فطری بلندیوں پر گواہ ہیں، میری رائے میں ان کی سب سے اچھی زندہ تصنیف تو فرمانروائے حال یعنی افتخار الملک سکندر صولت نواب محمد حمید اللہ خاں صاحب بہادر کی ذات گرامی ہے، جس نے بھوپال کو علم و سیاست کے اعتبار سے بین الملکی شہرت عطا کر دی ہے۔ نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ کے دور فرمانروائی میں بھوپال علم و ادب کے میدان میں بھی برطانوی ہند سے کسی طرح پیچھے نہ تھا، یہاں محکمۂ تاریخ قائم تھا جو تصنیف و تالیف کے سلسلے میں بہت اچھی خدمات انجام دے رہا تھا۔ مولوی عبد الرزاق کانپوری کی البرامکہ اور نظام الملک طوسی

کے علاوہ بیشمار معیاری تصانیف کو اس دور کی زندۂ جاوید یادگاروں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔

ہندوستان کی مشہور اور ممتاز ہستیوں کو منتخب کرکے بھوپال لانے اور ان کی نگرانی میں یہاں عمدہ علمی ٹکسال قائم کرکے قیمتی سکّے ڈھالنے کی ابتدا بھی نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ ہی نے کی۔ چنانچہ انھوں نے ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کو بلاکر محکمۂ تعلیم کے سب سے بڑے عہدے پر فائز کیا، پھر مفتی انوارالحق بھوپال آئے جو ایک مشہور علمی خاندان کے چشم و چراغ تھے اور انھوں نے علم و ادب کے اس گہوارے میں بڑے سکون کے ساتھ اپنا تصنیفی مشغلہ جاری رکھا۔ اثبات واجب الوجود اور ذکر حبیب سے مؤلف کے اس روحانی سکون کا اندازہ ہوسکتا ہے، جو اسے بھوپال آکر نصیب ہوا۔ ڈاکٹر بجنوری کے بعد مفتی صاحب موصوف محکمۂ تعلیم کے نگراں مقرر ہوئے، ان کے علاوہ ہندوستان کے دوسرے مشاہیر بھی یہاں مدعو ہوتے رہتے اور ان کے ارشادات گرامی سے اہل ملک کو فیضیاب ہونے کا موقعہ فراہم کیا جاتا، خواجہ کمال الدین لاہوری بھی کئی بار بھوپال آئے اور انھوں نے مختلف عنوانوں پر تقریریں کیں۔

دور حمیدی بھوپال کے لئے ایک عجیب علمی انقلاب اپنے ساتھ لایا۔ اس کی وجہ ایک تو یہ تھی کہ افتخار الملک نواب محمد حمید اللہ خاں صاحب نے ایک ایسی ماں کی آغوش محبت میں پرورش پائی تھی، جو ایک علمی گہوارے کا حکم رکھتی تھی۔ پھر ان کی تعلیم نہایت اچھے پیمانے پر ہوئی اور ان کے لئے بہترین اتالیق مہیا کئے گئے۔ یہی وجہ تھی کہ مادر مشفقہ نے ملک و قوم کی جو امانتیں ان کے سپرد کیں ان میں کسی قسم کا زوال و انحطاط نہ ہوسکا بلکہ ان کا اصل سرمایہ ترقی پذیر رہا۔ نظام حکومت میں معقول اصلاحات ہوئیں، تعلیم کی شمع زیادہ بہتری سے روشنی دینے لگی اور ملک کے تمدن و معاشرت نے ایک نئی انگڑائی لیکر آنکھیں کھولدیں۔ عوام کی آوازوں سے ایوان حکومت میں ہلکی سی گونج پیدا ہونے لگی، ان سب باتوں کے باوجود ہندوستان کی بین الاقوامی شہرت رکھنے والی ہستیوں سے مضبوط اور سرپرستانہ رابطہ قائم رکھنے کی روایت بدستور باقی رہی۔ مولانا محمد علی، شوکت علی، مہاتما گاندھی، سرتیج بہادر سپرو، چودھری سرظفراللہ، پنڈت نہرو، قائداعظم محمد علی جناح اور دوسرے مقتدر سیاسی رہنماؤں کا بھوپال سے دوستانہ تعلق رہا اور خود تاجدار بھوپال نے ہندوستان کے سیاسی ماحول میں اپنی بہترین دماغی صلاحیتوں کے باعث قائدانہ حیثیت حاصل کرلی اور نہایت نازک مواقع پر ملک کی مختلف سیاسی پارٹیوں کے مابین اختلافات کی خلیج کو پاٹنے میں زبردست مخلصانہ سرگرمی دکھائی، جس کو ملک کے ہر طبقہ میں سراہا گیا۔ اسی عہد میں سرراس مسعود کا وزیر تعلیم کی حیثیت سے تقرر ہوا، اُن کے توسط سے علامہ اقبال بھی

جو میری نظر میں عالم اسلام ہی کے شاعر نہ تھے، بلکہ عالم انسانیت کے ترجمان اور نبض شناس بھی تھے، بھوپال کے عقیدتمندوں میں شامل ہوگئے، علامہ نے "ضرب کلیم" فرمانروائے بھوپال کے اسم گرامی سے معنون کی اور ہندوستان میں ترقی پسندانہ رجحان پیدا کرنے والے نامور شاعر حالی پانی پتی کی صد سالہ برسی پر اعلیٰ حضرت فرمانروائے بھوپال کی موجودگی میں، فضا کی نالیوں کو اس نغمۂ شیریں سے آشنا کیا۔

مزاج ناقہ را مانند عرفی نیک می بینم	چو محمل راگران بینم حُدی را تیز تر خوانم
حمید اللہ خاں اے ملک و ملت را فروغ از تو	ز الطاف تو موج لالہ خیزد از خیابانم
طواف مرقد حالی سزد ارباب معنیٰ را	نوائے او بجانہا افگند شورے کہ من دانم
بیا تا فقر و شاہی در حضور او بہم سازیم	تو بر خاکش گہر افشان و من برگ گل افشانم

یہ وہ زمانہ تھا جب علامہ اقبال، اعلیٰ حضرت فرمانروائے بھوپال کا عطا کردہ وظیفہ قبول فرما چکے تھے، دوسرے شعر کے مصرعہ ثانی میں انھوں نے نہایت لطیف انداز سے اس کا اعتراف بھی کیا ہے اور اپنی خوشنوائی کو موصوف کی شاہانہ فیاضی کا نتیجہ قرار دیا ہے۔

اقبال اور بھوپال کے روابط پر ان خطوط سے کافی روشنی پڑتی ہے، جو علامہ نے سر راس مسعود اور ان کے علم دوست سکریٹری مسٹر ممنون حسن خاں کو وقتاً فوقتاً لکھے ہیں۔ یا پھر وہ طویل اور پُرسکون قیام اس کی شہادت ہے، جو بار بار اپنے زمانۂ علالت میں علامہ نے بھوپال میں کیا۔ یہاں آکر انھیں ایسا دماغی و ذہنی سکون حاصل ہوتا تھا، جو صحیح معنی میں جنت کا تصور ان کی بےچین روح میں پیدا کر دیا کرتا تھا۔

بھوپال کی علمی و ادبی روایات یہیں ختم نہیں ہو جاتیں تفصیل کے ساتھ انھیں بیان کرنے کے لئے بڑی فرصت درکار ہے۔ اس وقت میں بہت سرسری نظر سے یہ مختصر سا جائزہ لے سکا ہوں۔

سہارا

نذیر رحمانی

وہ آلتی پالتی مارے سردی سے ڈلی کترا کرتی تھی، جیسے مضمون نگار وقت گزاری کے لئے ڈائری لکھا کرتے ہیں، لیکن اب اس نے یہ شغل بھی چھوڑ دیا تھا اور وہ چپ چپ رہنے لگی، ــــ اداس اور متفکر ــــ جو بھی اسے دیکھتا، محو حیرت ہو کر رہجاتا، دانتوں میں انگلیاں داب کر کچھ سوچنے سمجھنے پر مجبور ہو جایا کرتا، ــــ وہ خود بھی عالم خیال میں گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹکائے گھنٹوں کھوئی کھوئی سی رہتی، کھانے پہننے کی اسے کوئی تکلیف نہ تھی، پھر بھی نہ وہ پہلے کی طرح انتظام و اہتمام سے کپڑے بدلتی اور نہ کھانے دانے کی طرف متوجہ ہوتی۔ یہ واقعہ ہے کہ کسی دن بھی اس سے پیٹ بھر کر روٹی نہ کھائی گئی، ایک رات بھی وہ گہری نیند نہ سو سکی، ہفتے، مہینے، یہاں تک کہ سال گزرتے چلے گئے، جیسے مریل دکمزور بیلوں سے جتی ہوئی گاڑی دھیرے دھیرے چلتی رہے اور اپنے پیچھے درخت، پہاڑ اور گاؤں کے گاؤں چھوڑتی چلی جائے ــــ ستر بہتر روپیے ہر مہینے اسے ملتے رہے، مگر دیکھنے والوں نے کبھی اس کے چہرے پر آثار شگفتگی نہ پائے، اس کے بال تو پہلے ہی سے سفید تھے، پر اب تو کمر بھی جھکی جھکی نظر آنے لگی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے وہ بوڑھی ہو گئی ہو ــــ بہت زیادہ بوڑھی ــــ اس درجہ بوڑھی کہ ایک ٹھوکر کھاتے ہی گر پڑے اور روح قفس عنصری سے پرواز کر جائے، ایک دالان سے دوسرے دالان تک پہنچنے ہی میں اس کے پاؤں لڑکھڑانے لگتے تھے۔ پھر بھی وہ آسمان پر اڑتے ہوئے جہازوں کی گھڑگھڑاہٹ سنتے ہی پلنگڑی گھسیٹ کر آنگن میں لے آتی اور اوپر نظریں اٹھائے ٹکٹکی باندھے جہازوں کو دیکھا کرتی، ــــ جہاز ایک ایک کر کے گزر بھی جاتے، مگر وہ اسی محویت کے ساتھ خالی آسمان کو تکا کرتی ــــ ایک شکاری کی طرح ــــ جیسے کوئی کبوتر باز، انتہائی بلندی پر کھو جانے والے کبوتر کو گھور گھور کر تلاش کر رہا ہو ــــ یہاں تک کہ اس کی گردن دکھنے لگتی، آنکھیں تھک جاتیں اور ان میں آنسو نکل پڑتے ــــ کبھی دالان میں لیٹے لیٹے اس کی نظریں مکان کی چھت پر جا پہنچتیں اور کھپریل پر سے ہٹے ہوئے کویلوں کے روزن میں سے جھانکا کرتی، ایسا معلوم ہوتا جیسے کوئی جہاز واقعی چلا آ رہا ہے ــــ اس نے سنا تھا کہ اب لڑائی ختم ہو گئی ہے، تمام سپاہی واپس ہو رہے ہیں، مگر اس کا ساجد کسی جہاز سے نیچے نہ اترا، ریل کے آنے کے وقتوں پر بھی اسٹیشن پر کوئی نہ کوئی ضرور اسے لینے گیا، مگر وہ ریل سے بھی گھر نہیں آیا ــــ جانیوالے

برابر آتے رہے، سنوں ہار کے گجرے پہنے ہوئے ــــ اور وہ ایک ایک سے اس کا حال پوچھتی رہی! اس کی شمع امید برابر جلتی رہی، خطوط برابر آتے رہے، اس کے تیرہ و تار دماغ میں برابر روشنی پھیلاتے رہے ــــ وہ ہر ایک سے کہتی رہی ــــ اس کا ساجد آئیگا ــــ آئیگا ــــ اور ضرور آئیگا ــــ!

ــــــــــ :۲: ــــــــــ

ساجد نے لشتم پشتم جس طرح بنا، ایف اے تو کر ہی لیا، لیکن مالی مشکلات کی وجہ سے بی اے نہ کر سکا، مقامی سرمایہ داروں سے بطور قرض کچھ رقم بھی لینے کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہو سکی، حصول وظیفے کی بھی کوشش کر دیکھی، مگر نتیجہ صفر ہی رہا۔ چاروں طرف سے مجبور ہو کر ملازمت اختیار کر لی۔ انگریزی اچھی تھی، افسران ذیشان نے پینتیس روپیے تنخواہ اور پانچ روپیہ الاؤنس منظور کر لیا، والدین نے فوراً ہی اُس کی چچا زاد بہن صفیہ کے ساتھ رشتہ شادی بھی طے کر لیا اور ایک سال تک کے لئے رخصتی کا معاملہ اُٹھائے رکھا، لیکن ساجد اس مدت کو بھی ناکافی سمجھتا تھا۔ اس کی آرزو تھی کہ ایک سال نہیں، دو سال، تین سال، چار سال، بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے یہ معاملہ التوا ہی میں پڑا رہے۔ مگر اس کا کیا علاج کہ ہندوستان کے ماں باپ جلد سے جلد اپنی نوجوان اولاد کو ملازمت کی ہتھکڑی پہنوا دیتے ہیں اور بیوی کی بیڑی لگوا کر مجبور، بے بس کر دیتے ہیں ـــ ساجد سے کہلایا گیا کہ اس ذمہ داری کو عملی طور پر قبول کرنے کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ لیکن ساجد کی روح لرزتی تھی، قدم ڈگمگاتے تھے، اس کے کمزور بازو اس بار عظیم کو سہارنے کے لئے تیار نہ تھے، وہ اچھی طرح سمجھتا تھا کہ زمانے کی ہوا کا رُخ کدھر ہے، اسکول و کالج کی پڑھی ہوئی لڑکیوں کا معیار حیات بھی اس کی نظروں سے پوشیدہ نہ تھا، ــــ صفیہ کی طرز زندگی سے بھی وہ اچھی طرح واقف تھا! اُسے معلوم تھا کہ تیس چالیس روپیے کی تنخواہ میں صفیہ کی خاطر داری و ناز برداری نہیں ہو سکتی ــــ وہ اسی شش و پنج میں سرگرداں رہنے لگا، دفتر میں کام کی بھرمار، دل و دماغ میں شادی کا بھوت، ــــ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی صحت گرنے لگی، وہ سوچ ہی رہا تھا کہ کیا کیا جائے ــــ یکایک سنہ ۱۹۳۹ء کی جنگ چھڑ گئی اور وہ فوراً فوج میں بھرتی ہو گیا، باپ نے منع کیا مگر وہ نہ مانا، ماں نے تو خودکشی کا ڈر بتایا، طرح طرح کی دھمکیاں دیں لیکن اس پر بھی ساجد خاکی وردی اپنے گھر میں لے ہی آیا۔ اور جب وہ اُسے پہنکر باہر نکلتا تو اس کے باپ کو بڑی خوشی حاصل ہوتی، لیکن ماں کانپ جاتی، وہ ایک نامعلوم خوف سے سہمی سہمی سی رہتی تھی۔ اُس کی بے نور آنکھوں اور چہرے کے پھیکے پن سے ایسا معلوم ہوتا تھا ــــ جیسے کوئی چور ــــ جسے ہر لمحہ یہ ڈر لگا رہتا ہو کہ کب پولیس کو علم ہو جائے اور وہ پکڑ کر حوالات یا جیل میں بند کر دے۔ سب اُسے سمجھاتے بھی تھے کہ ابھی تو

ساٹھ ہی روپے ہیں اور ترقی ملیگی، راشن مفت دیا جائیگا، سیکڑوں سپاہی خدمتگاری میں رہیں گے ـــــ مگر اس کی ماں کے لئے یہ سب کچھ ـــــ کچھ نہیں تھا ـــــ البتہ صفیہ دل ہی دل میں خوش تھی اُس کے گھر والے بھی اب اور زیادہ مطمئن نظر آتے تھے، اور خود ساجد بھی سخت محنت و جانکاہی سے اپنے فرائض کی بجا آوری میں منہمک تھا کرکٹ، فٹبال کی مسلسل دوڑ دھوپ نے اس کے جسم کو مضبوط بنا دیا - بھری رانیں، چوڑا چکلا سینہ، اور سڈول بازو ـــــ اس کے روشن مستقبل کے آئینہ دار تھے ـــــ! ایسے ہی جسموں کو فوج میں ترقی کے مواقع جلد حاصل ہو جایا کرتے ہیں۔ ساجد نے تھوڑی ہی مدت میں دو فیتے حاصل کر لئے اور افسروں نے خوش ہو کر محاذ جنگ پر بھیجدیا۔ صفیہ نے جب سنا، دل بیٹھ گیا۔ اس کے بس میں ہوتا تو وہ ساجد کے قدموں پر گر پڑتی اور اُسے روک لیتی، وہ اپنی زبان سے تو کچھ نہ کہہ سکی تھی مگر ـــــ اس کی خاموش نگاہیں کہہ رہی تھیں ؎

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت میں ملیں گے
کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور (غالب)

ساجد کے جانے کا دن ـــــ اس کی ماں کے لئے ـــــ "تلخیٔ کام و دہن کی آزمائش" کا دن تھا ـــــ مگر ساجد کے رگ و پے میں "زہر غم" پوری طرح اُتر چکا تھا، وہ اپنا اثر دکھا کر رہا ـــــ پلٹن کی ملازمت نے ساجد کے نرم و نازک دل میں فولاد بھر دیا تھا، جس پر ماں کی فریاد و فغاں ـــــ وعظ و نصائح، اور گریۂ و زاری بھی اثر انداز نہ ہو سکی، وہ ساجد، جو مظلوم و مجبور انسانوں کو روتا ہوا دیکھ کر خود آنسو بہانے لگتا تھا، آج اپنی ماں کو روتا ہوا چھوڑ کر چلدیا، جس نے کبھی فاختہ اور چڑیا کو کنکری پھینک کر نہیں ماری تھی - وہ ساجد ـــــ آج انسانوں پر گولیاں چلانے کے لئے روانہ ہو گیا ـــــ یتیموں کو لاوارث کرنے، جوانوں کے سہاگ اجاڑنے، ـــــ اور ہنستی کھیلتی آبادیوں کو ویرانوں میں بدل دینے کے لئے ساجد جہاز پر سوار ہو گیا ـــــ ایک عہدہ دار بنکر ـــــ کمر سے پستول باندھ کر ہاتھ میں رائفل لیکر ـــــ لیکن اُس کی ماں سے جیسے سب کچھ چھن گیا ـــــ

ـــــ : ۳ : ـــــ

ساجد طبروق کے ایسے محاذ پر تھا، جہاں اس کو کچھ سوچنے کی بھی فرصت نہیں تھی، ایک ایک اور دو دو ہفتے، ایک حالت میں گزر جاتے، من بھر کا بوجھ ـــــ جہاں اس کے جسم پر چوبیں گھنٹے لدا رہتا تھا، وہیں اس کے دل و دماغ پر بھی جیسے تالا لگ گیا اور ذہن کُند ہو گیا تھا۔ اُسے ایک دن کے لئے بھی اپنے باپ کا خیال نہ آیا، نہ دوستوں کا اُس نے اپنے نوجوان اور اپنے زیادہ خوبصورت حقیقی بھائی نا ہد کو بھی فراموش کر دیا تھا ـــــ ہاں کبھی کبھی صفیہ کا

ایک ہلکا سا دھندلا دھندلا خاکہ اس کی نظروں میں پھر جاتا تھا، مگر ماں کا خیال لمحہ بھر کے لئے بھی نہ آیا — اُس ماں کا — جس نے اپنی زندگی رو رو کر اجیرن کر لی تھی، مگر ساجد کی بلا جانے۔ وہ اُس جنگ کے جیتنے میں بُری طرح مصروف تھا، جس نے طوفان و آندھی سے سیلاب کی صورت اختیار کر لی تھی، جرمنی برابر آگے بڑھ رہے تھے۔ چاروں طرف بندوقوں، بموں اور توپوں کا لرزہ خیز شور برپا تھا۔ ہر طرف چیخ پکار، — آہ و بکا اور واویلا مچی ہوئی تھی، حدِ نظر تک میدان کے میدان سرد لاشوں سے پٹے پڑے تھے، — کسی کا سر کٹ چکا تھا، دھڑ غائب تھا، کوئی ٹانگوں اور ہاتھوں سے جدا ہو چکا تھا، مگر ساجد زندہ اور صحیح سلامت تھا۔ وہ سر سے کفن باندھے لڑتا رہا، مشین گن سے گولیاں برساتا رہا، جوانمردی و بہادری کے ساتھ اپنے بریگیڈ کا ساتھ دیتا رہا۔ قید ہوا — قید سے بھاگا۔ پھر لڑا اور اس وقت تک لڑتا رہا جب تک کہ زخمی ہو کر ہاسپٹل میں نہ پہنچا دیا گیا۔ اُس کی ران میں گولی لگی تھی، اور گہرا زخم آیا تھا جس کے اچھے ہونے میں کئی ماہ صرف ہوے۔ اس نے اپنی یہ تمام حالت تحریر کر دی، مگر سنسر بورڈ نے اس خط پر ڈاکا ڈالا اور گھر تک نہ پہنچنے دیا۔ ماں کی پریشانی برابر بڑھ رہی تھی، اس لئے اس نے فوٹا ہوائی جہاز کے ذریعے خط لکھ کر خیریت دریافت کی، مگر کوئی جواب نہ آیا، جواب دیتا بھی کون، ساجد روسیوں کی فوجوں کو بھگا کر اپنے بریگیڈ کے ساتھ قاہرہ پہنچ گیا تھا، وہاں بھی اس نے مردانگی و دلیری کے وہ جوہر دکھلائے کہ افسروں کو ساجد کی فولادی قوت کا لوہا ماننا پڑا۔ اُسے اعتراضات سے سرفراز کیا گیا، لیکن وہ اپنے گھر والوں سے بے نیاز و بیخبر ہوتا رہا، ماں برابر خط بھیجا کرتی، مگر وہ سب کے سب محاذات کے تبدیلی کی وجہ سے اِدھر اُدھر ہو جاتے اور اُس کو نہ ملتے — صفیہ کے ماں باپ بھی خیر خبر لینے اکثر گھر آیا کرتے تھے، مگر انھیں نامراد و ناکام واپس لوٹنا پڑتا تھا۔ صفیہ سنتی کہ ساجد کا اب کوئی خط نہیں آتا تو وہ اپنے ہی دل میں غالب کا یہ مصرعہ پڑھ کر خاموش ہو جایا کرتی

تیرے تیرِ نیم کش کو، کوئی میرے دل سے پوچھے

مگر ساجد کے دل سے ہر خلش مٹ چکی تھی، وہ اپنے ترکش کے سیکڑوں تیروں کو اپنے ہی جیسے جوان، تندرست انسانوں کے سینہ و جگر کے پار کر چکا تھا، ہمدردی اس سے دور بھاگ چکی تھی، جس طرح قلعی گر پرانے برتنوں پر سے زنگ اور گندگی دھو کر صاف اور چمکدار بنا دیا کرتے ہیں، بالکل اُسی طرح عسکری ماحول نے ساجد کے دل سے خلوص محبت کو دھو دیا تھا۔ اُس کے دل میں ذرا بھی نرمی اور لچک باقی نہیں رہی تھی۔ وہ انعام و اکرام کی دھن میں ہمیشہ آگے بڑھنے کے منصوبے سوچا کرتا تھا — اپنے بریگیڈ کا کمانڈر بننا اُس کی زندگی کی آخری آرزو بن کر رہ گئی — وہ ایک دن دنیا کے نقشے پر اُنگلیاں پھیر رہا تھا کہ اتفاقاً اِدھر سے کچھ مصریوں کا گزر ہوا۔ ایک مصری نے

حقارت بھری نظروں سے ساجد کو دیکھا اور اپنے ساتھیوں سے کچھ کہا۔ ساجد کئی دن تک اس گفتگو کا مطلب نہ سمجھ سکا، آخر ایک روز ایک دوسرے مصری سپاہی سے پوچھا کہ تمھاری قوم مجھے کیا کہا کرتی ہے، اُس نے بتایا کہ مصر کے نوجوان اور مزدور تمھیں بزدل، ذلیل، کمینہ، اور کتا کہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تم اپنے ملک و قوم کے غدار اور خائن ہو۔ ہندوستان میں انگریزوں کی عمر کو دراز کرنے کے لئے تم مصروف پیکار ہو، تم خود اپنے ہاتھوں اپنی اور اپنی نسل کی گردنوں میں غلامی کا طوق ڈال رہے ہو۔ جس درخت کو کھود کر پھینک دینا چاہئے، تم خود اپنے اپنے خونِ حیات سے اس کی جڑوں کو مضبوط کر رہے ہو، جس انگریز کے مبارک عہد میں قحط پڑے، جنگ چھڑے، جیل خانے بھرے، لاکھوں آدمی تڑپ تڑپ کر مر گئے، سیکڑوں عورتیں جوہرِ عصمت کی تاراجی پر مجبور ہوئیں —— آج تم اسی انگریز کا ساتھ دے رہے ہو —— اور ہم اس کے تسلط کو مصر سے ہٹانا چاہتے ہیں تو ہمیں سے مقابلہ کرتے ہو، لڑتے ہو، گولی چلاتے اور چلواتے ہو، بم برساتے ہو —— شرم نہیں آتی تم کو —— !"

ساجد نے یہ سب کچھ سنا اور ایکدم اس کا چہرہ زرد پڑ گیا، خون جیسے سرد ہو گیا ہو، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے جسم کی ساری حرارت کافور بنکر اڑ گئی ہو —— اُسے یاد آ گیا کہ جس دن میں نے بھرتی کے دفتر میں نام لکھوایا تھا، اُس دن میرے سول آفس کے ساتھیوں اور دوستوں نے مخالفت کی تھی، لیکن میں نے انھیں سمجھا دیا تھا کہ وطنِ عزیز کو دشمن کے شکنجوں سے نجات دلانے کے لئے میرا یہ اقدام مفید اور ضروری ہے —— اُس وقت بھی اس کے جواب میں یہی سب کچھ کہا گیا تھا جو آج ایک مصری نے بتایا۔ پر اُس وقت رگ رگ اور نس نس میں جوانی کا نشہ سرایت کیے ہوئے تھا، لیکن اب ایسا معلوم ہوا جیسے غیر ملک کے ایک فرد نے اس کی آنکھوں کی پٹی کھولدی —— بیگانوں کے نشتر اپنوں سے زیادہ کھٹک پیدا کرتے ہیں —— ساجد نے فوراً اپنا ارادہ ملتوی کیا اور استعفیٰ لکھکر اپنے جنرل سے واپسی کی اجازت چاہی —— جنرل نے اور زر کا لالچ دیا، عہدے کے اضافے کا وعدہ کیا اور اس سے زیادہ بھی بہت کچھ سمجھایا —— مگر ساجد کچھ سننے کے لئے تیار نہ ہوا۔ اب وہ ملیٹری وردی اتار کر پھینک دینا چاہتا تھا —— ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نذرِ آتش کر دینے کے لئے آمادہ تھا —— مگر اس کے جنرل نے ڈانٹ دیا اور صاف صاف حکم سنا دیا کہ اگر تم بخوشی نہ رہو گے تو ہم تم کو اپنے اختیاراتِ خصوصی سے بہ جبر رکھیں گے، تم یہاں سے خاتمۂ جنگ تک کہیں نہیں جا سکتے۔

——:۴:——

محاذ کے مورچے پر ساجد کو ایک بار پھر جان کی بازی لگا دینی پڑی، وہ مجبور تھا، اُس کے افسروں نے اس کے خلاف

ہدایات جاری کردی تھیں کہ ساجد کے معمولی مظاہرۂ سرکشی پر اُسے گولی کا نشانہ بنا دیا جائے ـــــ وہ مستعدی مگر مجبوری سے اپنی ڈیوٹی انجام دیتا رہا، آگ اور خون کا کھیل کھیلتا رہا، اس سے پہلے بھی وہ کئی خطرناک مورچوں پر کامیابی سے گذر چکا تھا، اس لئے ہوشیار و تجربہ کار سمجھا جاتا تھا۔ یہاں بھی افسروں نے اُسے ہمیشہ اور ہر حالت میں آگے ہی رکھا، وہ اس میں بھی خوش تھا، اس کی عین آرزو تھی کہ دشمن کی کوئی گولی بھی اس کا رشتۂ حیات کاٹ دے، اب وہ کسی صورت میں بھی ہندستان واپس جانا نہیں چاہتا تھا، اُسے اب نفرت ہوگئی تھی۔ ہر چیز سے نفرت، اس کا دل بجھ گیا تھا ـــــ مگر آنکھیں کھُل گئی تھیں۔

دن گذرتے رہے، گولیوں کی بارش ہوتی رہی، شفاخانہ زخمیوں سے بھرتا رہا ـــــ مگر ساجد نہ تھک سکا، وہ برابر اپنے مخالفوں سے جنگ کرتا رہا، سیکڑوں کو موت کے گھاٹ اُتارتا رہا اور خود بچتا رہا ـــــ جیسے اُس پر رحمت خداوندی کا سایہ ہو۔ وہ ہر اُفتاد و مصیبت سے محفوظ رہا، آخر ایک دن ایسا بھی آیا کہ ساجد کو چھٹی مل گئی اور وہ آزاد ہوگیا، وہاں جانے کے لئے جہاں اُس کا دل چاہے، اب اُسے روکنے اور منع کرنیوالا کوئی نہ تھا! ـــــ اس نے لڑائی جیت لی تھی، دشمن نے ہتھیار ڈالدیے تھے، جنرل نے پورے دو مہینے کی رخصت ساجد کو ہندستان جانے کے لئے دیدی تھی ـــــ مگر ہندوستان سے تو اُسے نفرت ہوگئی تھی۔ ہندوستان! غلام ہندوستان ـــ جہاں انسان بھی جانوروں سے بدتر زندگی گزارنے کے لئے مجبور کئے جاتے ہیں ـــــ مگر جب اُسے گھر کا خیال آتا تو دل میں خوشی کا مور ناچنے لگتا ـــــ صفیہ کے تصوّر سے تھوڑی دیر کے لئے اس کے چہرے پر خون دوڑ آتا! اس کا خیال تھا کہ صفیہ مجھے محو انتظار ملیگی۔ اس کا بھائی۔ باپ اور ماں ـــــ سب اُس کو خواب کی طرح دکھائی دیتے ـــــ اس نے اپنی کامیابی کی اطلاع بھی دیدی، رخصت کا بھی لکھدیا، اور ایک آخری خط میں اپنے آنے کا ذکر بھی کر دیا، لیکن اس کے دوستوں نے اتنی جلدی جانے سے منع کیا اور روک لیا، گھر آنے میں اور دن لگ گئے ساجد اپنے ساتھیوں کے ساتھ جشن فتح مناتا رہا، کبھی یہاں، کبھی وہاں، ریل کا سفر بھی کیا، سمندری جہاز پر بھی بیٹھا، ہوائی جہاز کی بھی سیر کی ـــــ ایسا لطف و سرور حاصل کیا، جو اس سے پہلے کبھی میسّر نہ آسکا تھا۔ گو اس سے پہلے کئی بار یہ مواقع حاصل ہوچکے تھے، فرق اتنا تھا کہ وہ نوکری و مجبوری کے سفر تھے ـــــ اور یہ آزادی و مرضی کی اڑانیں تھیں۔ ایسے ہی ایک روز ساجد اپنے ساتھیوں کے ساتھ جیپ کار میں بیٹھا شوق شکار میں پہاڑوں پر درّاتا ہوا چلا جا رہا تھا کہ اچانک ایک ٹیلے سے ٹکر ہوئی اور اُس کی جیپ کار الٹ گئی، ایک ساتھی زخمی ہوا، لیکن ساجد کا سر ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا، بھیجے کا پتہ بھی نہ چلا کہ کدھر گیا ـــــ اس کے دوسرے ساتھی زخمی کو اور

ساجد کے خون میں بھرے ہوئے جسم کو موٹر میں رکھکر اپنے کیمپ میں لے آئے، زخمی کو شفاخانے میں اور ساجد کی لاش کو جنرل کے سامنے پیش کیا، جنرل نے ملیٹری آرڈر کے مطابق ایک ہزار روپیہ اُس کے ورثا کو دینا تجویز کیا

ساجد کے گھر میں خوشی کے چراغ روشن کئے جا رہے تھے، شادیانوں کا انتظام کیا جا رہا تھا، لیکن جیسے ہی یہ خبر مرگ موصول ہوئی، سارے گھر میں اندھیرا ہوگیا۔ خوشی خرمی کے گھر میں صف ماتم بچھ گئی، جو لوگ سہرے گجرے لیکر مبارکباد کے پیغام لانے والے تھے، وہ اظہار تعزیت کے لئے آنے لگے، بھائی پچھاڑیں کھانے لگا صفیہ کے گھر جب یہ خبر گئی تو اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہہ نکلا ـــــ مگر ماں جس نے یہ سب سوگ پہلے ہی منا لیے تھے، اب مطمئن تھی۔ اُس کا خیال نہیں تھا بلکہ پختہ یقین تھا کہ اس کا ساجد زندہ ہے، وہ آئیگا اور ضرور آئیگا۔

رونے پیٹنے سب ختم ہوگئے! ایک موت پر، کاروبار عالم پر موت نہیں آیا کرتی۔ زندگی کی گاڑی پھر چلنے لگی سب ہنسنے گانے لگے! ساجد و صفیہ کے گھر والوں نے آپس میں مشورہ کرکے "واجد و صفیہ" کو ایک دوسرے کا شریک حیات تجویز کر لیا، کسی کو انکار و مخالفت کی جرأت بھی نہ ہوسکی اور شادی کی تیاری شروع ہوگئی۔ مگر کارخانۂ قدرت بھی عجیب ہے جس کی مشین اور پہیئے کبھی ایک حالت میں نہیں رہتے، ہمیشہ حرکت کرتے ہی رہتے ہیں، کھٹ کھٹ، کھٹ کھٹ ـــــ تغیر و انقلابات آتے ہی رہتے ہیں، چولے بدلتے ہی رہتے ہیں ـــــ مگر سب مجبور رہتے ہیں، کسی کو یارائے دم زدن نہیں ـــــ!

سکون و یکسوئی کا زمانہ تھا، شادی کے دن قریب تھے، بڑھیا ماں دروازے پر بیٹھی راہ تک رہی تھی! ڈاکیہ کے آنے کے وقت وہ روزانہ اُسی طرح انتظار کیا کرتی تھی۔ ڈاکیے کے تھیلے کو وہ اس طرح دیکھتی جیسے اس میں ساجد کا خط نہیں بلکہ خود ساجد بیٹھا ہے اور وہ فوج سے چھپکر، دنیا کی نظروں سے اپنے کو بچاکر، گھر آ رہا ہے۔ ڈاکیہ ضرور آتا اور چلا جاتا، مگر وہ دروازے پر سے نہیں اُٹھتی، ـــــ ایک روز پھر ڈاکیہ آیا اور ایک ہزار روپیہ ملازمت کا معاوضہ لے کر آیا، لیکن ماں نے لینے سے انکار کر دیا اور صاف کہدیا کہ مجھ بوڑھیا سے کیوں مذاق کرتے ہو! میرا بیٹا مجھ سے کہہ گیا ہے کہ ماں! میں جلد ہی واپس آؤں گا ـــ آؤں گا ـــ اور ضرور آؤں گا میرا بیٹا جھوٹ نہیں بولتا، سچ بولتا ہے، اس نے باپ سے کہا تھا میں جنگ پر ضرور جاؤں گا ... ـــ وہ چلا گیا ـــ اب اسی طرح وہ آئیگا ضرور آئیگا۔

واجد نے، واجد کے باپ نے، عزیزوں نے، محلے والوں نے، سب نے سمجھایا کہ آئی مایہ نہ چھوڑو

ایک چمن

غازی بنگلوری

ایک چمن کو یاد ہے میری وفا کی داستاں
اس نے دیکھا ہے مرے دل کے تڑپنے کا سماں
یاد ہیں اس کو وفائیں عشقِ خوش آغاز کی
یاد ہیں اس کو جفائیں حسنِ عشوہ ساز کی
یاد ہے اس کو وہ خونابہ فشانی یاد ہے
پتے پتے کو جوانی کی کہانی یاد ہے
اس چمن کا خار بھی تھا اِک گلِ رنگیں مجھے
ذرہ ذرہ تھا یہاں کا جنتِ سیمیں مجھے
اس زمیں پر چشمِ حسرت خون برساتی رہی
حسن کی اِک اِک ادا ارماں کو ترساتی رہی
اہلِ گلشن کو مبارک عیشِ گلشن کے مزے
ہم نے لوٹے ہیں یہاں فریاد و شیون کے مزے
ایک گوشے میں کوئی آشفتہ حال و اشکبار
اک نظر کے واسطے، اُف، وہ کسی کا انتظار
[illegible] کسی کو دیکھنا روتے ہوئے وہ دور سے
اور غرضِ ضبط کرنا وہ دلِ رنجور سے
حسرتیں روندی گئیں میری اسی کی خاک پر
خاک ہی ڈالی گئی میرے دلِ غمناک پر
غیرتِ الفت کو میری خوب تڑپایا گیا
[illegible] میں دل کی تمناؤں کو نہلایا گیا
[illegible] شام و سحر میں تو لہو روتا رہا
[illegible] گی، اپنی خوشی کھوتا رہا
[illegible] ہے مرا اب اس چمن کو دیکھ کر
[illegible] ہے گلوں کی انجمن کو دیکھ کر
[illegible] وہ زمانہ رہ گیا ❁ اہلِ گلشن کی زباں پر اک فسانہ رہ گیا

نشانہ

سلیمان پاشا

رل مزدور۔ یا جیل کے قیدیوں کی طرح ایک گھنٹے کی آواز پر اور ایک ہی قانون اور قاعدے میں میرا جسم مشین کی پرزوں میں حرکت کرتے کرتے جب تھک جاتا ہے تو اکثر والہانہ طور پر گھر سے نکل جاتا ہوں۔ مگر آج تو کچھ سماں ہی بدلا ہوا تھا "ہندو مسلم فساد"! "ڈائرکٹ ایکشن"! "کابینی مشن" اور ہندوستان!؟ تمام چیزیں یکے بعد دیگرے میرے خیالات کو پراگندہ کر رہی تھیں اور ہندوستان کی موجودہ گتھی کو سلجھانے کی جتنی کوشش کی جا رہی تھی، اتنی ہی الجھتی جا رہی تھی۔ انگریز واقعی اپنی پالیسی میں کامیاب ہو گیا۔ اُسے تو ہندوستان میں حکومت کرنا ہے خواہ وہ مسلم لیگ کے سر پر ہو یا کانگریس کے سر پر۔ بہرحال ہوں ہندوستانی!! اور پھر ٹھیک بھی تو ہے۔ اُسے اس وقت ہندوستانیوں کو اپنانے کی سخت ضرورت ہے، جبکہ اس کے پرانے نمک حلال، بہی خواہ، جاں نثار اور ہمیشہ وفادار رہنے والے جہازی، اور ہوائی بیڑے نے بھی علم بغاوت بلند کر دیا...... اگر اب بھی وہ ناخوش ہے تو حکومت ہاتھ سے گئی۔ دینا دینا کچھ نہیں! ۔ اپنی بنیادوں کو کچھ دن کے لئے اور مستحکم بنانا ہے۔ پھر کانگریس بھی تو خفیہ طور پر زبردست تیاریاں کر رہی تھی۔ وہ تو کہیے بیالیس میں خیر ہو گئی۔ لیکن اب ناممکن تھا۔ اس لئے کیوں نہ ان میں سے ایک پر ہاتھ صاف کیا جائے۔ فریق ثانی خود بخود گڑبڑ کریگا اور پھر ہونگے جھگڑے فساد، اور ہندوستان کو آسانی سے دنیا بھر میں بدنام کیا جا سکے گا اور انگریزوں کی ہندوستان میں موجودگی کی اشد ضرورت ظاہر کی جا سکے گی۔

یک بیک میں جھنجھلا سا گیا ـــــ کیا لغو باتیں سوچنے لگتا ہوں میں بھی اکثر۔ اور جب میری قوت متخیلہ ان سیاسی گورکھ دھندوں میں الجھ جاتی تھی تو سخت کوفت ہوتی تھی۔ کتنے برے ہیں یہ ہندستانی! میرے بھائی؟ ان ذہنی الجھنوں سے تنگ آکر میں اُٹھ کھڑا ہوا اور شہر سے دور نامعلوم منزل کی طرف لمبے لمبے ڈگ بھرتا چل پڑا۔ تھوڑی دور چلا تھا کہ کتوں نے استقبال شروع کر دیا۔ ہر طرف خطرے کے سائرن کی طرح بھوں بھوں ہونے لگی۔ یہ کتے......؟ ان کو نہ کوئی منہ لگاتا ہے نہ پالتا ـــــ لیکن یہ بھی ہندوستانیوں کی طرح آنکھیں بند کر کے بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں اور پھر فرض صحیح انجام دیں تو کوئی مضائقہ نہیں، اس معاملے میں وہ پولیس کی تقلید کرتے ہیں، شاید اسی لئے پولیس کے کتے مشہور ہیں، اور پھر ان کو تیز چلنے والوں سے للّہی بغض ہے۔ سست اور

کابل ان کے دوست ہیں۔ میں نے ہاش ہوش کرکے پیچھا چھڑایا اور پھر چلتا بنا۔

صبح کی تفریح کی طرح خیال تھا کہ احمد نگر کے قلعے کا طواف کیا جائے۔ مگر کب تک جب سے یہاں آیا تھا کئی چکر کولہو کے بیل کی طرح کاٹ چکا تھا۔ اگر اتنے چکر بھاڈروں سے لگاتا تو کئی ہندوستانی دیویاں مری ہو چکی ہوتیں۔ یا اگر انگلستان میں کورٹ شپ میں اتنے دن ضائع کرتا تو سینکڑوں لیڈیوں کی مرضی حاصل کر چکا ہوتا۔ لیکن برناڈ شاہ کہتا ہے کہ صبح کی تفریح انسانی صحت کے لئے ضروری اور ورزش میں تیز چلنے کی ورزش سب سے افضل ہے۔ پھر میرا بھائی بھی جو کم وبیش ڈاکٹر ہے یہی کہتا ہے، کہ میں ورزش کیا کروں۔ مجبور ہوں کہ ایک ساکت اور بے جان چیز کے چکر پروانے کی طرح کاٹا کرتا ہوں۔ ان سب کے باوجود اپنے ہم جنسوں کی فطرت عادت، چال ڈھال اور مزاج کو تو آج تک میں نہ سمجھ سکا۔ انسانی خود غرضیں۔ آپس کے جھگڑوں۔ اختلاف رائے کے باعث تنازعوں سے تنگ آکر مجبوراً انسانوں سے تنگ دامنی اختیار کرلی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وطن چھوڑ دیا اور اب کبھی جانے کا ارادہ کرتا ہوں تو وہی بحر ظلمات میرے سامنے پھرنے لگتا ہے۔ تاریکیوں اور جہالتوں کے بھنور۔ مجبوراً ارادہ ترک کردیتا ہوں۔ اور خندق کے اندر پلے ہوئے سادہ لوح ہرنوں سے دوستی کررکھی ہے۔ وہیں عشق کی پینگیں بڑھتا ہوں۔

خندق کے پاس پہنچ کر میں نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر درخت کو پکڑ کر ایک جھکولا لیا اور دھم سے نیچے کود گیا پھر ملیٹری بینڈ پر چلنے والی شاندار چال کے ساتھ فاتحانہ انداز میں اپنی جگہ جا کر بیٹھ گیا۔ فاختائیں اور طوطے میرے سر پر منڈلانے لگے اور تھوڑی دیر میں اٹکھیلیاں کرتے، کلیلیں بھرتے، ہرن میرے پاس آگئے۔ میں نے ایک ہرن کے رخساروں پر بوسہ دیا۔ اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتا رہا اور اس کے پاؤں میں پاؤں ڈال دیئے۔ پھر نہ معلوم کتنی دیر تک اس سے محبوبانہ باتیں کرتا رہا۔ میں نے اس سے تمام سرگذشت پوچھ ڈالی۔ یہاں تک کہ میں نے جذبات کی رو میں اس سے کہدیا کہ وہ اس غلامی کی زندگی پر موت کو کیوں ترجیح نہیں دیتا۔ غلامی کی زندگی بھی کیا زندگی ہے! ۔ اس پر میرے محبوب کے آنسو نکل پڑے۔ اس نے میرے شانوں میں گردن ڈالدی اور زبان حال سے کہنے لگا: "میرے محسن! مرجانا بھی آسان ہے؟ موت تو اسی دن آگئی جب تم وطن سے نکلے وہ دن گئے، وہ عہد شباب گیا۔ اب زندہ ہیں زندہ درگور!۔ انسان ڈھائی ہاتھ گہری قبر میں دفن ہوتا ہے، ہم دس فٹ گہری قبر میں دفن ہیں۔ ہماری نسلیں تباہ ہوگئیں۔ نہ ڈھنگ کی خوراک ہے نہ پانی ـــ اس راشن سے ہماری زندگی قائم رہ سکتی ہے؟

نشانہ

انسان کتنا بزدل ہے، ہر ما کے ہاتھیوں کی طرح خود غلام ہے اور دوسروں کو غلام بنانے میں مصروف!
بھلا یہ کیا ضروری ہے کہ قلعے کے اندر تمہارے سیاسی لیڈر بند ہوں تو قلعے کے باہر ہم بے زبان قید وہ ام کاشتا سیلے۔
بیالیس کا خون آشام دور چلا گیا، ہزاروں نے جان دیدی اور سیکڑوں بے گناہ مارے گئے ـــــ بچے یتیم ہوئے
عورتیں بیوہ، لیکن لیڈر سکون اور اطمینان کی زندگی گذارتے رہے اور آج لاکھوں کے خون سے ہاتھ رنگ کر
مہندی رچاتے خوش نظر آتے ہیں اور عجب کیا کہ یہی لوگ کرسیاں سنبھال لیں۔ مرنے والے مر گئے ان کو کون
پوچھتا ہے۔ وہ روتا رہا۔ اور اپنی دکھ بھری کہانی سناتا رہا۔ میری بھی آنکھ سے آنسو نکل پڑے۔ میں نے بھی اپنی
برادری کے نفاق کا رونا شروع کر دیا۔

کھٹ کھٹ کھٹا کھٹ کی آواز نے مجھے چونکا دیا ـــــ میرا محبوب گھبرا کر بھاگ گیا، کہ یکایک تاریکی میں سے
ایک عورت گھوڑے پر سوار میری طرف آتی دکھائی دی۔ خندق کی اونچی دیوار پر اس نے اپنا گھوڑا روک دیا۔
اور دونوں پاؤں باندھ کر خندق میں کود پڑی۔ میں بھی گھبرا گیا ـــــ آیۃ الکرسی، سورۃ فاتحہ اور اسی قسم کی دوسری
دافع بلیات آیتیں پڑھنا شروع کیں لیکن وہ برابر میری طرف بڑھتی رہی۔ میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے،
اور حواس باختہ ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد آنکھ کھلی تو دیکھا کہ ایک عورت زرہ بکتر میں ملبوس میرے سامنے کھڑی
کہہ رہی تھی ـــ اے غلام آباد کے بجیں انسان! تو کتنا بزدل ہے، اپنے احباب سے بھاگتا ہے ـــــ
ہندستان جنّت نشان کو جہنم گمان بنا دیا۔ تجھے اپنے وجود کا احساس نہیں!۔ تجھے اپنے اسلاف کے کارنامے
نہیں معلوم؟ ہاں معلوم ہیں کیوں نہیں؟ ایشوری پرشاد کی تاریخ میں سب کچھ پڑھا ہے۔

بلیک ہول! میسور کی پہلی لڑائی۔ اورنگ زیب سوامن جنیؤ تلوا کر کھانا کھاتا تھا، یہی نا۔ میں نے کہا
اسے شہر خموشاں کے بے روح انسان! یہ کیا کہا تو نے۔ تو عدل جہانگیری بھول گیا، تو رانا پرتاب کو بھول گیا
تو ہندستان کو بھول گیا۔ اور اس کے ساتھ اس کی ہر ایک چیز کو! تو ان ہندستانیوں کو بھول گیا، جنھوں نے
اس کے لئے قربانی دیکر اس کو چار دانگ عالم میں ممتاز بنا دیا۔ تو بھول گیا سلطان ٹیپو کو!۔ اور اس سلطانہ کو
جس نے شہزادہ مراد کی توپوں کے منہ موڑ دیئے اور مرد شکن بہادری دکھائی۔ وہی سلطانہ جو کبھی اپنی حکومت میں
ہندستانیوں کی فرمانروائی تک پسند نہ کرتی تھی، یہی وہ سلطانہ ہے جس نے نسوانی بہادری کا ریکارڈ قائم کر کے
مردوں کی گردنوں کو شرم سے جھکا دیا ہے۔ لیکن ایک تم ہو کہ تیرہ سو سال پیشتر کے بدو بنے ہوئے ہو، اور
کوئی ۱۶ اگست منا رہا ہے تو کوئی ۹ اگست۔ خدارا ۹ اگست ہی منالو یا سولہ اگست ہی۔ یکجہتی اور اتحاد پیدا کرو

اور مادرِ وطن کو غلامی کے جوئے سے آزاد کرالو۔ میں تو اپنے پروگرام میں کامیاب رہی، لیکن کیا خبر تھی کہ پھر مہاراشٹر میں توکیا ہندستان میں بھی کوئی ایسا مردِ میدان پیدا نہ ہوگا، جو اپنی چیز کو پا سکے گا۔ دہلی میں شاہجہاں کی روح لال قلعے میں گورے سپاہیوں کے ڈر سے ندی کے کنارے چھپتی پھرتی ہے۔ موتی مسجد جلی میں قدم رکھنے سے فرشتے کانپتے ہیں، مسجد نمائش گاہ بنی ہوئی ہے۔ جامع مسجد جلی خچر باندھنے کی جگہ رہ گئی ہے۔ اور ہمایوں کا مقبرہ بہادر شاہ ظفر کو بھی نہ چھپا سکا۔ افسوس میری روح قلعے کے خندق میں قید ہوکر رہ گئی ہے۔

وہ قلعہ جس کی حفاظت میں نے جان کی بازی لگاکر کی تھی آج اغیار کے قبضے میں ہے اور میرے ہموطن اس کے دیکھنے کو ترستے ہیں، اور اس کو آج دیش بھگتوں کے بند کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ کیا تمہیں اس ڈھائی سو سالہ عمارت کے جھٹکے نہیں سنائی دیتے جیسے سمندر پار گرنے والی ہے۔ اٹھ اے قسمت کے شاکی انسان اٹھ!۔ تدبیر کی شمشیر سے تقدیر کی دائمی غلامی کے پھندے کاٹ ڈال۔ آج انقلاب کا دن ہے۔ آج عملی اقدام کی باری ہے، آج یوم احتجاج ہے! اور یہ دن بے زبان جانوروں میں رہ کر نہیں منایا جاسکتا۔ اٹھ دیکھتا کیا ہے؟ وقت کا فرمان یہی ہے کہ بڑھ! ۔ معزز چاند سلطانہ! میں نے کھڑے ہوکر کہا " آج بیالیس ۴۲ کے شہیدوں کا خون رنگ لائیگا۔ آج جلیان والے باغ میں گل لالہ کھلیں گے۔ آج بلیا کے بدلے کی باری ہے۔ میں عہد کرتا ہوں کہ ہندستان ہمارا ہے اور ہمارا رہیگا۔ آج ہندستان کے چپے چپے سے بابر، ہمایوں، اور رام نکلیں گے۔ اب لال قلعہ ہمارا ہوگا اور ہندستان ہندستانیوں کا ہوگا —— تڑ تڑ —— تڑ تڑ —— خطرہ! خطرہ!!

میں نے خیال کیا میری سلامی ہے شاید!۔ یا انگریزی سپاہیوں کو چاند سلطانہ کی موجودگی کا احساس ہوگیا! اس نے ایک چھلانگ لگائی اور ایک لمحے میں خندق سے پار تھی، دوسرے لمحے میں نظر سے اوجھل تھی۔ میں نے بھی اسی جوش میں ایک چھلانگ لگائی اور خندق کے پار پہنچ گیا۔ قلعے سے باہر نکل کر میں نے شاہی برج پر ایک متقامی نظر ڈالی لیکن اس پر لگا ہوا یونین جیک شاید میری حماقت اور ہوائی قلعوں پر مسکرا رہا تھا۔ میں اسی سرگرمی سے گویا انتقام لینے آواز کی طرف تیز تیز چلنے لگا۔ میں جوش وجذبہ میں چلتا رہا یہاں تک کہ اس جگہ پہنچ گیا جو ان آوازوں کا منبع تھی۔ مظلوم و بے گناہ ننھے بچے، عورتیں اور آدمی ایک انبوہ کثیر اور دوسری طرف خاکی وردی میں ملبوس ہندستانی! ایک بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ گولیاں چل رہی تھیں اور لوگ ہنسی خوشی جان دے رہے تھے۔ میں نے بھی ایک رائفل اٹھائی اور اسی جذبے میں ایک سپاہی کو نشانہ بنایا۔ اشانگر پا تکی پہنچ چکی تھی، لیکن یکایک دماغ کے احکام خلاف توقع صادر ہوئے۔ وہ ہندستانی ہے!۔ ہندستانی ہمارا نشانہ؟ دوسرے لمحے ایک تڑ کی آواز میں دھم سے جاگرا۔ وہ بھی ہندستانی تھا!!۔

جنونِ بندگی

از حضرت راحت کوٹی

وہ عالم سے جواب بیگانگی معلوم ہوتی ہے
محبت کی یہ حدِ آخری معلوم ہوتی ہے

نگاہِ شوق قدموں پر جھکی معلوم ہوتی ہے
یہ تکمیلِ جنونِ بندگی معلوم ہوتی ہے

کوئی بھی ہو مگر صورت تری معلوم ہوتی ہے
مجھے تو یہ عنایت عشق کی معلوم ہوتی ہے

محبت اپنے دیوانے کو لائی ہے سرِ منزل
محبت حاصلِ دیوانگی معلوم ہوتی ہے

کسی کی یاد کا نشتر اترنا چاہیے دل میں
کہ پھر دردِ محبت میں کمی معلوم ہوتی ہے

ترے دلکش تصور سے تری رنگیں محبت سے
ہماری زندگی اب زندگی معلوم ہوتی ہے

یہ کیا گورِ غریباں ہے یہاں سے لے بھی چل وحشت
یہاں تو پھیکی پھیکی چاندنی معلوم ہوتی ہے

اجازت ہے مجھے تو پھونک دے برقِ تبسم سے
کہ مجھ پر اب گراں یہ زندگی معلوم ہوتی ہے

بہاریں مسکراتی آ رہی ہیں ساتھ ساتھ اُن کے
دلِ پژمردہ میں پھر تازگی معلوم ہوتی ہے

گناہوں کی کمی سے حشر میں کیا سر اٹھاؤں میں
تری چشمِ کرم سے شرم سی معلوم ہوتی ہے

جنوں میں جلوۂ رنگِ بہار آ ہی گیا آخر
قفس کی سرزمیں رنگین سی معلوم ہوتی ہے

قرینے سے تو بیٹھے ہیں سبھی دیوانۂ الفت
مگر محفل میں راحت کی کمی معلوم ہوتی ہے

ماموں چھن نے خط لکھنے کا ارادہ کیا

—— لڈن میاں کے قلم سے

کلو نے ماموں چھن کے خط لکھنے کے لئے سارا انتظام کر دیا۔ میز لگائی۔ کرسی لاکر رکھدی۔ قلم دوات ملی نہیں اسے ڈھونڈنے لگا۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے دیر ہوگئی اور ماموں چھن کرسی پر بیٹھے بیٹھے تھک گئے۔ جھلا کر بولے "اول تو میں لکھنے کا عادی نہیں، اور اگر خدانخواستہ لکھنے کا ارادہ کیا تو قلم دوات اس طرح غائب جیسے گدھے کے سر سے سینگ یا جیسے کنجوس کے تہہ خانے اور تجوری میں روپیہ چھپ جاتا ہو —— گدھے! کیا الہ دین کا چراغ لاؤں یا جام جمشید جو تجھے یہ قلم دوات لادے، یا یہ بتادے کہ فلاں جگہ رکھی ہوئی ہے۔"

"حضور! تلاش تو کر رہا ہوں، جب ملجائیگی تو لادوں گا....." کلو نے جواب دیا۔

وہ تو میں پہلے ہی سمجھتا تھا کہ آج قلم دوات ضرور غائب ہوگی —— یہ کہکر وہ بھی تلاش کرنے لگے۔ اب یہ دونوں تلاش کر رہے ہیں اور وہ دونوں ہیں کہ غائب!۔

یا اللہ کیا وظیفہ پڑھوں یا چلا کھینچوں ..... مجھے تو خط لکھنا ہے ..... اور لکھوں تو کیونکر لکھوں۔ لاحول ولا قوۃ گھنٹہ بھر ہوگیا۔ سارا خط کا مضمون بھول گیا۔ پھر سوچنا پڑیگا..... کلو! تو تو ہمارا کہا سنا معاف کر، اب ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دے ہم تو باز آئے۔ تشریف لے جائیے مہربانی ہوگی، کام چور کہیں کا۔ نہ معلوم کہاں چھپادی ہیں۔

کلو سہما ہوا تلاش میں مصروف تھا۔ آخر کار بولا: تو حضور محلے سے مانگ لاؤں....

ماموں چھن کو غصہ آگیا..... ہنہ وہ تو ہم سمجھتے ہی تھے، تو محلے میں جاکر کہیگا: آج علامہ چھن مدظلہ العالی خط لکھ رہے ہیں، لیکن اتنے بڑے عالم فاضل ہوکر قلم دوات نہیں رکھتے گویا سب تحریر کے کام زبانی اور روحانی طریقے سے مرسل الیہ کے پاس پہنچا دیتے ہیں، یا جادو کا پتلا بناکر اور اُسے طوطے کی طرح رٹا کر روانہ کر دیتے ہیں —— یہ کبھی نہیں ہوسکتا کہ تو محلے سے میرے لئے دوات قلم لائے۔ میری ناک کٹوانے کی فکر میں ہے۔ میں ذلیل ہوجاؤں گا، منہ دکھانے کے قابل نہ رہوں گا۔ پاگل، گدھے۔

کلو یہ سب باتیں سنتا، تلاش کرتا اور دل ہی دل میں کہتا رہا کہ خدا ان کی حالت پر رحم فرمائے۔ بیچارہ گڑگڑا کر دعا مانگ رہا تھا کہ انھیں قلم دوات مل جائے —— ماموں چھن بڑبڑاتے رہے۔ محلے سے لادوں صاحب۔

ہنہ ڈھول سے کر پیٹ۔ بجاتا ہوا چلا جاکہ ہے کوئی سخی داتا جو ہمارے علامہ چھمن کے لئے اپنا قلم دوات خیرات زکات دیدے۔ ڈھول پیٹ، کوئی نہ کوئی تو اللہ کا بندہ رحم کھا ہی لیگا۔ خط لکھنا بھی مصیبت ہوگیا۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔ ابھی تو اہتمام خط ہے ـــ ہے کیسا گھنّا ـــ بیچارہ کلوا عجب مصیبت میں پھنسا ہوا تھا۔ اگر اس دوران یعنی ماموں چھمن کے غصّے کی حالت میں بول اُٹھا تو شامت ہی آجائے گی۔ بولا تو کیوں بولا، اور اگر نہ بولا تو کیوں نہ بولا، گھنّا ہے ـــ مصیبت سراپا مصیبت ـــ ماموں چھمن کو جھوبجھ، غصّہ، عجلت، دل کو پریشانی اور پھر قلم دوات کے نہ ملنے کی پشیمانی ـــ ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک کر آخر کار "قہر خود بر جان خود" کے مصداق بیٹھ گئے ـــ اب ملے یا نہ ملے ـــ رہنے دے، تلاش نہ کر۔ میں نہیں لکھوں گا۔ کلوا خاموشی کے ساتھ ڈھونڈتا رہا۔ میں کہہ رہا ہوں کہ وہ نہ ملیں گے۔ چار آنکھیں دیکھ چکیں پھر تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد کہنے لگے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں خط لکھنے کا چور ہوں خط یا مضمون لکھنا کار بیکاراں سمجھتا ہوں، پھر بھی لوگ بار بار خط لکھ کر مجھے پریشان کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ میں بھی خط کا جواب خط ہی سے دوں۔ لاحول ولاقوۃ ـــ یہ کبھی نہیں ہوسکتا۔ خدا کی قسم خط کبھی نہ لکھوں گا۔ میں جب خط لکھنے بیٹھتا ہوں۔ ایسا ہی کوئی حادثہ پیش آجاتا ہے۔ خط لکھنے کا تمیز نہیں لیکن خط لکھتے ہیں ضرور ـــ املا غلط، ہجے غلط۔ الفاظ کا استعمال غلط یعنی غلط۔ عبارت بے ربط اہل۔ گندہ تحریر۔ خط کا مضمون جیسے مجذوب کی بڑ یا پاگل کی باتیں۔ کہیں سر کہیں پیر۔ پوری بکواس ـــ اصول تحریر معلوم نہیں۔ طریقۂ خطاب کی خبر نہیں، مگر کم بخت خط لکھنا نہیں چھوڑتے اور بھی جیسے خاص خلوص و محبّت رکھتے ہیں، ان جیسا ہمدرد دنیا کے پردے پر نہیں ـــ او کلوا میں کہہ رہا ہوں کہ مت تلاش کر میں ہرگز نہ لکھوں گا ـــ آج ہی تمام دنیا کے اخبارات میں اطلاع دیئے دیتا ہوں کہ خدا کے لئے کوئی صاحب خط تحریر فرما کر میرا قیمتی وقت ضائع نہ کریں۔ میں بڑے موٹے موٹے حروف میں لکھوا دوں گا کہ کوئی صاحب کسی بڑے مستند استاد سے اصلاح لئے بغیر میرے پاس خط یا کوئی تحریر روانہ نہ کریں ورنہ اُن کی تحریر واپس کر دیجائیگی اور کوئی جواب دیا جائیگا سمجھ میں نہیں آتا کہ جب خط لکھنا جانتے ہی نہیں تو لکھتے کیوں ہیں ـــ چار کتابیں پڑھ لیں اور سمجھنے لگے کہ ہم بڑے اہل ہیں ـــ "آتا ہے یاد مجھ کو گذرا ہوا زمانہ" ـــ طالب علم سالہا سال استادوں کے سامنے تختی لکھا کرتے تھے اور کبھی قابلیت کا دعویٰ نہیں کرتے تھے۔ عالم فاضل ہو کر بھی یہی کہا کرتے تھے کہ ہم کچھ نہیں جانتے۔ جب تو اُن کی یاد اب تک دلوں میں باقی ہے اور وہ جو کچھ کہہ گئے یا کر گئے پتھر کی لکیر ہے۔

ماموں چھمن نے خط لکھنے کا مادہ کیا

اپنی جگہ بالکل صحیح ۔ آج سے قسم کھاتا ہوں کہ کبھی خط نہ لکھوں گا اور نہ مضمون ـــــ کلوا مت تلاش کر دوات قلم اب کوئی ضرورت باقی نہیں رہی ـــــ پوسٹ مین نے دروازے کی زنجیر کھٹ کھٹائی اور کلوا نے ایک عدد خط ماموں چھمن کو لا کر دیا۔ ماموں چھمن کو دیکھتے ہی غصہ آ گیا ـــــ خط ۔ خط ۔ خط ۔

ناک میں دم آ گیا ان خطوں سے ـــــ گویا میں کوئی میر منشی یا ڈاکخانہ ہوں ۔ کلوا محلے میں جاکر کہہ دے کہ جن صاحب کو خط بھیجنا ہو وہ ڈاکخانے کے بجائے میرے مکان میں ڈالدیا کریں ـــــ لاحول ولاقوۃ ـــــ خط پڑھنے کے بعد کلوا کو دیا کہ جلادے اسے چولھے میں ـــــ ایسے خطوں کا ہرگز ہرگز جواب نہ لکھوں گا ـــــ کلوا نے بڑی انکساری سے پوچھا "حضور کس کا خط ہے ۔ کیا لکھا ہے . . . .

ماموں چھمن ! "چپ رہ . . . . . اوہ آپ ہیں جناب ہزار میر لندن پلٹ"

کلوا نے بڑی حیرت سے کہا "لندن پلٹ . . . . . ہاں ہاں لندن پلٹ ، یعنی لندن ریٹرنڈ ۔ میں لندن ریٹرنڈ کیوں لندن پلٹ نہ کہوں ، بالکل صحیح . . . . . "کیا لکھا ہے حضور" کلوا نے پوچھا ـــــ ماموں نے جواب دیا لکھا کیا ہے ، بکواس ہے نری بکواس ، شروع سے آخر تک ۔ جاہل ۔ میرے مضامین پر تنقید کی ہے ، گویا اس جاہل کی تنقید کی وجہ سے علامہ چھمن آج سے ادیب نہ رہے ۔ میں پھر آواز بلند و بانگ دہل کہتا ہوں آجکل کے نوجوانوں میں یہ صلاحیت نہیں کہ وہ مل جل کر کوئی کام کر سکیں ۔ جسے دیکھو پانچویں سواروں میں ہونے کا دم بھرتا ہے ـــــ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بناتے پھرتے ہیں ، کوئی سمجھائے تو کہہ دیا کہ یہ دقیانوسی خیال کا آدمی ہے ۔ خدا سمجھے ان نوجوانوں کو ۔ اب ہم جیسوں کو تو اس دنیا میں رہنے کا کوئی حق ہی نہیں رہا ۔ لکھتے ہیں : بڑی حیرت ہے کہ آپ نوجوانان قوم سے اتنے شاکی ہیں کہ اگر آجکل کے نوجوان کام سے ہاتھ اٹھالیں تو ناؤ چلنا مشکل ہو جائے ۔ جس تحریک میں دیکھیے پیش پیش ہیں ـــــ ماشاءاللہ لٹیا ڈبوئے دے رہے ہیں ـــــ میں تو چاہتا ہوں کہ قوم کی حالت درست ہو ، لیکن یہاں کسے پرواہ ہے ۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میری ساری تحریریں اور تحریکیں ان نوجوانوں کی وجہ سے ناکام ہوئیں ـــــ کلوا سے پھر بولے : تو کلوا ذرا لا تو قلم دوات ، ان سب باتوں کا ایسا دانت توڑ اور منہ پھوڑ جواب دوں کہ خط لکھنا بھول جائیں ـــــ حضور آپ کیوں منہ پڑتے ہیں ایسے لوگوں کے ۔ خط لکھ کر توہین کرتے ہیں اپنی ـــــ کلوا بولا ـــــ نہیں نہیں نہیں ضرور لکھوں گا ، تاکہ آئندہ اس قسم کی گستاخی نہ کریں ۔ میری شخصیت پر تک حملے کئے ہیں ۔ مذہب ، مذہبی روایات احکام سے بالکل نابلد ۔ شاید یہ بھی معلوم نہیں کہ مذہب ہے کس چڑیا کا نام ، اور انسان بننے کے لئے

کن کن باتوں کی ضرورت ہے، لیکن گدھے نے میری ایک مذہبی تجویز پر بھی تنقید کرکے اپنے گدھے پن کا ثبوت دیا ہے۔ مذہبی باتوں سے کوئی لگاؤ نہیں، اگر کچھ بتاؤ تو سنیں گے نہیں۔ ہزار جیلے حوالے کرکے وہاں سے چلدیں گے لیکن تنقید و تبصرہ بعد میں ضرور کریں گے۔

میری ایک ایسی ہی تجویز کے بارے میں جو سب کے لئے یکساں فائدہ مند تھی، لکھتے ہیں کہ اگر آپ اپنی اس تجویز کے ذریعے کوئی فائدہ اُٹھانا چاہتے ہیں تو یقیناً یہ آپ کے لئے جتنی مفید ہے، اتنی ہی دوسروں کے لئے نقصان دہ۔ توبہ توبہ۔ لاحول ولاقوۃ۔ فرماتے ہیں خط میں۔ اگر آپ اپنی تجویز کے ذریعے جامع مسجد کے امام بننا چاہتے ہیں تو یہ معاملہ ضرور اُٹھائیے۔ سبحان اللہ کیا قابلیت ہے۔ میں رفاہ عام کے لئے کوئی تجویز پیش کروں تو گویا جامع مسجد کا امام بننا چاہتا ہوں، یا یہ کہ یہ میری تجویز کوئی خطبۂ جمعہ یا نماز جنازہ ہے۔ استغفراللہ۔ گویا ان کے نزدیک امامت کوئی بڑی چیز نہیں ہے۔ بس یہی قابلیت ہے کہ ایک خط کے سیدھی طرح معنیٰ بھی نہ نکال سکے ــــــ کلوا تو قلم دوات دیدے، اب مجھ سے صبر نہیں ہو سکتا۔ میں ابھی جواب لکھتا ہوں، کیا معنیٰ کہ وہ میرے خطوں کا اس طرح جواب دیں۔ میرا مذاق اڑائیں، پھبتیاں کسیں اور میں چپ بیٹھا رہوں۔ آگے چل کر تحریر فرماتے ہیں۔ فرماتے کیا ہیں مشورہ دیتے ہیں، مشورہ۔ فرماتے ہیں کہ اگر آپ اپنی خودساختہ تحریکوں کو ختم کرکے ملازمت کرلیں، اور پُوَر ہاؤس یعنی محتاج خانہ کے افسر ہوجائیں تو زیادہ مناسب ہے ــــــ بس اب مجھ سے ضبط نہیں ہو سکتا۔ کلوا قسم اُس پاک پروردگار کی جو کہ سب کا رزاق حقیقی ہے کہ میں اس توہین کو برداشت نہیں کر سکتا۔۔۔۔ وہاں کی ملازمت کرلوں یا بالفاظ دیگر "چودھری فقیران" ہو جاؤں۔ گدھا پاگل اُتو جاہل ــــ آگ لگادے اس خط کو میں کہہ رہا ہوں ــــ خط لکھنے کی تمیز نہیں، اور خط لکھتے ہیں، مذاق اڑاتے ہیں ــــ اُردو میں خط ہے انگریزی میں پتہ۔ کیا میں تنقید نہیں کر سکتا۔ کیا یہ غلط روِیّہ نہیں۔ کلوا تو ہی بتا، میں غلط کہہ رہا ہوں؟ اگر بین الخطوط فساد ہو جائے تو؟ تو ان نوجوانوں کی بلا سے۔ سچ کہتا ہوں اس فساد کو رفع کرنے والا ڈھونڈے بھی نہ ملیگا۔ کلوا بیچارہ چپ چاپ سب باتیں سنتا رہا اور وہ اس غصّے کی حالت میں بول بھی کیسے سکتا تھا۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن کی تو پیدائش ہے اور لیڈر بننا چاہتے ہیں۔۔۔۔ پتہ لکھتے ہیں انگریزی میں۔

"مسٹر ماموں چھمن صاحب" سبحان اللہ۔ قربان جائیے اس خطاب پر۔ مسٹر کے ساتھ صاحب بھی لکھ مارا جناب کی کسر رہ گئی پھر تو پتہ اور بھی خوبصورت ہو جاتا ــــــ خط شروع کرتے ہیں "مائی ڈیر" سے۔ گویا اب ہم نہ مکرّمی رہے نہ محترم نہ مدظلہٗ اور نہ دام مجدکم ــ لاحول ولاقوۃ۔ انگریزی کیا پڑھ لی کہ اپنی زبان سے

قصہ مراسلت ہی بھول گئے ـــــ انگریز کے باپ بنے پھرتے ہیں۔ گویا میکا سے کے اقوال کو گلی جامہ پہناتے ہیں ـــــ کلوا لا تو قلم دوات میں ابھی لکھتا ہوں۔ مقدمہ چلاؤں گا، حوالات بھجواؤں گا۔ سزا کراؤں گا۔ ایسی سخت توہین ـــــ کلوا بولا حضور ابھی نہ لکھیئے، تھوڑی دیر اور ٹھہر جائیے۔ میں تلاش کر رہا ہوں ـــــ اب تو ماموں چھمن آگ بگولا ہو گئے۔ ابھی تک تلاش ہی ہو رہی ہے۔ میری تو توہین ہو گئی، عزت چلی گئی اور تو ہے کہ ابھی تک تلاش ہی کر رہا ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ میں ابھی اور اسی وقت اور یہیں قلم دوات تجھ سے لوں گا۔ لکھوں گا اور لکھ کر ہی رہوں گا۔

ـــــ " ہاں ضرور لکھئے میں تو جب تک تلاش بھی کر لیتا، لیکن حضور ہی نے تو خط سنانا شروع کر دیا تھا ـــــ "

کلوا نے جواب دیا ـــــ ماموں چھمن نے کہا : تو نے اس خط میں آگ کیوں نہ لگا دی ؟۔

" آپ ہی نے تو غصے میں میرے ہاتھ سے لیا تھا " کلوا نے جواب دیا۔

" اچھا تو اب تو ہی بتا کہ تیرے سر سے لکھوں یا اپنی انگلیوں سے۔ کیا کروں " ماموں چھمن نے غصہ میں کہا۔

کلوا کو یاد آ گیا کہ قلم دوات کہاں رکھی ہے۔ وہ گیا اور جھٹ سے لے آیا، میز پر رکھ دی۔ ماموں چھمن نے کہا : اچھا اس میز کو اپنی جگہ رکھ کر آ پھر اپنا سر بھی دیوار سے پھوڑ لے اور میرا بھی پھوڑ دے۔ کلوا بیچارہ ہچکچایا ماموں نے کہا : "اٹھا کہ نہیں۔ کلوا بیچارہ میز کو اٹھانے کے لئے بڑھا۔ لیکن ہمت سے کام لیتے ہوئے پھر اس نے کہا : حضور خط تو لکھ لیں۔ ماموں چھمن نے اسے قلم دوات رکھتے ہوئے نہیں دیکھا تھا ـــــ میری چڑ بنائی ہے خط لکھوں ـــــ نہیں لکھتا ـــــ میں کسی کا نوکر نہیں ـــــ حضور یہ قلم دوات رکھی ہے، لکھ لیجئے، شروع کیجئے، کلوا نے جواب دیا ـــــ ماموں چھمن کو غصہ تو آ ہی رہا تھا اور بھی آ گیا۔ اور قلم دوات رکھی ہے، سنکر کچھ حیرت سی ہوئی ـــــ ایں ! رکھی ہے۔ کہاں رکھی ہے۔ اب تجھے زیادہ نظر آنے لگا ہے۔ اُن کی نظر قلم دوات پر پڑی فرمانے لگے یہ کس جن نے یہاں لا کر رکھ دی، پہلے تو نے مجھے کیوں نہ بتایا، کیوں مجھے اتنا چڑایا ـــــ " اب لکھ لیجئے حضور " کلوا نے جواب دیا ـــــ

میں اب ہرگز نہ لکھوں گا۔ کبھی نہ لکھوں گا۔ خدا کی قسم ـــــ کلوا نے کہا : حضور اتنی سی بات پر ناراض نہ ہوں۔ اگر مجھے نہ ملی تھی تو حضور کو بھی تو نہیں ملی تھی۔ حضور نے بھی تلاش کی، لیکن کہیں نظر نہ آئی۔ ماموں نے جواب دیا ـــــ کیا مطلب اس کا، یعنی میں اندھا ہوں ـــــ کلوا نے بہت سنجیدگی سے کہا " خدا نہ کرے اب شروع کیجئے "

" میری چڑ بنالی ہے تو نے ـــــ " یہ کہتے ہوئے وہ میز کی طرف بڑھے، کلوا سمجھا کہ شاید وہ

ماموں چھن نے خط لکھنے کا ارادہ کیا

وہ انہیں مارنے کو آرہے ہیں۔ وہ کچھ پیچھے ہٹ گئیں، اور ماموں چھن نے قلم دوات کو زور سے پھینکتے ہوئے کہا: شاید ہوں گی اور نہ آئندہ میں خط لکھوں گا ——— اب تو صبر آپ کو! ——— ساری ادبی تحریری اور ایسی ہی دوسری غلطیاں صرف انہیں کی وجہ سے ہوتی ہیں ——— اب تو صبر آیا ——— اب جب کبھی خط آیا کرے گا تو لکھدیا کروں گا کہ میرے پاس قلم دوات نہیں، اس لئے جواب دینے سے معذور ہوں ———!

(بقیہ "سہارا")

بیٹے کی شادی اچھی طرح ہوجائے گی۔ مگر ساجد کی ماں نہ مانی اور سارا روپیہ واپس کر دیا، ———

اُدھر صفیہ کو یہ خبر ملی اور اُس کا دماغ اُلٹ گیا، اسی دیوانگی کے عالم میں اُس نے شادی سے انکار کر دیا ——— وہ اس غلط فہمی میں مبتلا تھی کہ واقعی ساجد ابھی زندہ ہے، اس کی ماں کی مامتا ضرور اپنا اثر دکھائیگی اور وہ آجائے گا۔ اس نے ارادہ کر لیا تھا کہ اگر واجد سے شادی کر بھی دی گئی تو عین نکاح کے وقت انکار کر دوں گی اور پھر جب ساجد آجائے گا تب اسی کی شریک زندگی بنوں گی ——— زمانہ چاہے کچھ بھی ——— لیکن روپیہ آجانے کے بعد سے اُس کا وہم یقین میں تبدیل ہوگیا، وہ ہوش وحواس کھو بیٹھی، ——— پاگل ہوگئی ——— پاگل ———!

لیکن اس کی ماں کو روز اول سے جو رٹ لگی تھی، وہ لگی ہی رہی، کسی عنوان نہ مٹی ——— اب بھی اس کا ایمان ہے کہ اس کا جوان وتندرست بیٹا ساجد ——— آئے گا ——— آئے گا ——— کسی نہ کسی دن ضرور آئے گا ——— اور یہی ایمان اس کی زندگی کا سہارا ہے۔